قول و قرار

عدم

ادارۂ فروغ اردو ۰ لاہور

[illegible]

[illegible]

قول و قرار

عبد الحمید عدمؔ

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

قیمت : ۲/۸

پرنٹر : سویرا آرٹ پریس لاہور
پبلشر : محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو، لاہور

جام شرمائے، صراحی کو پسینہ آگیا
آپ کو بھی بات کرنے کا قرینہ آگیا

آ۔ ترے ایمان کو پھولوں کے رس میں غسل دوں!
محتسب، برسات کا رنگین مہینہ آگیا

مڑ کے دیکھا تھا کہ دریا ایک قطرہ بن گیا
آنکھ جھپکی تھی کہ ساحل پر سفینہ آگیا

ہائے! اُن مخمور آنکھوں کی پشیمانی کا حُسن
میں نے یہ سمجھا بہاروں کو پسینہ آگیا

ہو گئی پیوست دل میں اس طرح اُس کی نظر!
جس طرح خالی انگوٹھی میں نگینہ آگیا

ہو نہیں سکتا کہ شیشہ آئے اور صہبا نہ آئے
مے بھی آئے گی عدمؔ جب آبگینہ آگیا!

○

جو قطرہ تھا وہ ہستی بیچ کر دریا اُٹھا لایا
جو ذرّہ تھا وہ موقع ڈھونڈ کر صحرا اُٹھا لایا

ہمیں جب بھی اسیرِ بیدلی ہوتے ہوئے دیکھا
ترا وعدہ فریبِ جنّتِ فردا اُٹھا لایا

مرا سجدہ ترے قدموں کے رستے سے کہاں پہنچا
محبّت جب جبیں لائی جنوں کعبہ اُٹھا لایا

پریشاں رنگ، ویراں نکہتیں، ڈوبے ہوئے نغمے
گلستاں سے ہجومِ بیخودی کیا کیا اُٹھا لایا

نقابِ رُخ فقط اک مرتبہ ان کو اُٹھانا تھا
جنوں بد قسمتی سے دیدۂ موسیٰ اُٹھا لایا

عدم روزِ ازل جب قسمتیں تقسیم ہوتی تھیں
مقدّر کی جگہ میں ساغر و مینا اُٹھا لایا

○

جورِ خلاق کی تفریح کا ساماں ہونا
کس قدر مضحکہ انگیز ہے انساں ہونا

بندہ پرور یہ حجابوں کا تکلف کیسا
مستیٔ حسن کی تکمیل ہے عریاں ہونا

تیری رسوائی نہ بن جائے کہیں موت مری
آج میرے لئے ہرگز نہ پریشاں ہونا

زیست ہے یا کسی مفلس کا چراغِ خانہ
اس نے سیکھا ہی نہیں کھل کے فروزاں ہونا

عقل ہر چیز کو اک جرم بنا دیتی ہے
بے سبب سوچنا بے سود پشیماں ہونا

آؤ سو جائیں خزاں آنے سے پہلے اک رات
کون دیکھے گا بہاروں کا پریشاں ہونا

بعض راتوں کو تو ہوتا ہے محسوس مجھے
اتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

یہ گِلا تو مٹا دیا ہوتا
درد کو دل بنا دیا ہوتا

لوگ جب میرا ذکر کرتے تھے
آپ نے مسکرا دیا ہوتا

حشر کے دن تو سونے والوں کو
بندہ پرور جگا دیا ہوتا

ہم غریبوں کی بات ہی کیا تھی
بار تھے تو بھلا دیا ہوتا

لوگ بھوکے تھے صرف باتوں کے
کوئی قصّہ سُنا دیا ہوتا

دنیاداری تو فرض تھی تم پر
ایک آنسو بہا دیا ہوتا

اُس کی آنکھیں عدمؔ اگر کہتیں
ہم نے ساغر گرا دیا ہوتا

قول و قرار

کوئی آنسو ٹپک گیا ہو گا!
شیشۂ دل چھلک گیا ہو گا

سانس کا سلسلہ تو جاری تھا
اتفاقاً اٹک گیا ہو گا

رنگ کیوں اُڑ رہے ہیں پھولوں کے
کوئی غنچہ چٹک گیا ہو گا

حشر کا دن تو دُور تھا ساقی
تیرا سینہ دھڑک گیا ہو گا

برق کیا طور پر گری ہو گی
تیرا آنچل ڈھلک گیا ہو گا

جس مسافر میں کچھ خرد تھی عدمؔ
راستے سے بھٹک گیا ہو گا!

○

آدمی کی جگہ خدا ہو گا
وعدۂ حشر کیا وفا ہو گا

تھا کسی کا تو بوجھ کشتی پر —
میں نہیں تھا تو ناخدا ہو گا

لوگ کل کس کا ذکر کرتے تھے
آپ نے بھی تو کچھ سنا ہو گا

میری تصویر تو خراب نہ تھی
رنگ گھبرا کے اڑ گیا ہو گا

رات کٹنے کے منتظر ہو عدمؔ
رات کٹ بھی گئی تو کیا ہو گا

اُن کو عہدِ شباب میں دیکھا
چاندنی کو شراب میں دیکھا

آنکھ کا اعتبار کیا کرتے
جو بھی دیکھا وہ خواب میں دیکھا

داغ سا ماہتاب میں پایا
زخم سا آفتاب میں دیکھا

جام لا کر قریب آنکھوں کے
آپ نے کچھ شراب میں دیکھا

کس نے چھیڑا تھا سازِ ہستی کو
ایک شعلہ رباب میں دیکھا

لوگ کچھ مطمئن بھی تھے پھر بھی
جس کو دیکھا عذاب میں دیکھا

ہجر کی رات سو گئے تھے عدمؔ
صبحِ محشر کو خواب میں دیکھا

○

آپ اور غیر! دیکھا جائے گا
یہ ستم خیر! دیکھا جائے گا

اپنے دیرینہ خیر خواہوں سے
اس قدر بیر، دیکھا جائے گا

شیخ جی آپ سے پرندے اور
خلد کی سیر، دیکھا جائے گا

آپ مانے بھی ہیں کسی کا کہا؟
جائیے خیر! دیکھا جائے گا

اے عدمؔ اُس حسین کی منزل
حرم و دیر! دیکھا جائے گا

○

میکدے میں قیام تھا اپنا
ہر صراحی پہ نام تھا اپنا

انکھڑیوں کی شراب تھی اپنی
گیسوؤں کا خرام تھا اپنا

کتنی پختہ کمند تھی اپنی
کتنا مضبوط دام تھا اپنا

کہکشاؤں پہ گرد تھی اپنی
آسمانوں پہ گام تھا اپنا

موجِ صہبا نگاہ تھی اپنی
رقصِ مستی کلام تھا اپنا

موت کو زیست سے عقیدت تھی
زیست کو احترام تھا اپنا

بت کدہ احتیاط تھی اپنی
میکدہ انتظام تھا اپنا

گردشِ روزگار واقف ہے
کس فضا میں مقام تھا اپنا

کچھ ستارے رفیق تھے اپنے
اک ستارہ اِمام تھا اپنا

ہر تجلّی کنیز تھی اپنی
ہر فرشتہ غلام تھا اپنا

جس کو کہتے ہیں آفتاب، عدمؔ
وہ ستارہ بھی جام تھا اپنا

○

شاخِ گُل تھی، نہ آشیانہ تھا
وہم کا عکس تھا، فسانہ تھا

زندگی کے حسین دھوکوں سے،
ہم کو بھی ربطِ غائبانہ تھا!

زندگی کا فریب کیا کہا تے
زندگی موت کا بہانہ تھا

آہ! وہ دورِ زندگی ساقی!
جب ترا فیض والہانہ تھا

یا تری انکھڑیوں کی باتیں تھیں
یا طوافِ شرابِ خانہ تھا

پھول بکھرے ہوئے تھے راہوں میں
آسماں ایک شامیانہ تھا

لڑکھڑاتی ہوئی مشیّت تھی
رقص کرتا ہوا زمانہ تھا

جام میں اجنبی بہاریں تھیں
ساز میں آتشیں ترانہ تھا

ہر نفس میں شراب کی رَو تھی
ہر نظر میں نگارخانہ تھا

آنکھ جھپکی کہ بجھ گئی دنیا
خواب تھا یا کوئی فسانہ تھا

زندگی کے مبالغے کا ستم
ایک الزامِ شاعرانہ تھا

کھینچ کر لے گئی عدم قسمت
جس جگہ اُس کا آب و دانہ تھا

زندگی نام ہے روانی کا
کیا تھمے گا بہاؤ پانی کا

دن قیامت کا ڈھل نہ جائیگا
نام لے کر تری جوانی کا

تیرے چشمے کی خیر ہو ساقی
ایک چھینٹا حسین پانی کا

زندگی ہے کہ بے تعلّق سا
ایک ٹکڑا کسی کہانی کا

کس کی تفریح کا بہانہ ہے
حادثہ میری زندگانی کا

شمع کب تک بہائے گی آنسو
رات عنوان ہے کہانی کا

قیدِ ہستی کی دلفریبی ہیں
دام تھا کس کی مہربانی کا

دل سے نکلے گا جان لے کے عدمؔ
عشق آزار ہے جوانی کا!

○

اُس کی آنکھوں کا اعتبار رہا
کوئی نقشہ تو استوار رہا

ہجر کی رات آنکھ کیا لگتی
صبحِ محشر کا انتظار رہا

زندگی سے موافقت کر کے
میں بڑی دیر شرمسار رہا

صورتِ حال دلفریب رہی
دامنِ ہوش تار تار رہا

جب کسی راہرو نے دم توڑا
دو گھڑی جشنِ رہگزار رہا

غم بہرحال تھا دلیلِ حیات
دل بہرحال برقرار رہا

جس قدر تلخ تھا مذاقِ عدمؔ
حادثہ اتنا خوشگوار رہا

○

مسکرانے کا کچھ خیال تو تھا
زہر کھانے کا کچھ خیال تو تھا

یاد اِک زخم بن گئی ورنہ
بھول جانے کا کچھ خیال تو تھا

آپ نے راستہ ہی روک دیا
آنے جانے کا کچھ خیال تو تھا

قیمتیں ہی گراں تھیں تنکوں کی
گھر بنانے کا کچھ خیال تو تھا

اہلِ ساحل نے غور ہی نہ کیا
ڈوب جانے کا کچھ خیال تو تھا

اُن کے آنے کا گو یقین نہیں
اُن کے آنے کا کچھ خیال تو تھا

ہم کو دنیا عدمؔ نہ راس آئی
دل لگانے کا کچھ خیال تو تھا

○

اس طرح مسکرا کے یار ملا
جس طرح موسمِ بہار ملا

وقت سے کام جب پڑا ہم کو
وقت مصروفِ کاروبار ملا

حادثہ ہے کہ وہ بھی شاکی ہیں
جن کو ماحول سازگار ملا

جن کے دامن میں صرف کلیاں تھیں
اُن کا دامن بھی تار تار ملا

اُس کے ملنے کا ماجرا مت پوچھ
جو ملا محوِ انتظار ملا

یوں ملی ہم کو منزلِ مقصود
جس طرح راہ کا غبار ملا

زیست نے کس سے کی نباہ عدمؔ
جبر پر کس کو اختیار ملا

○

ارمانوں کی جوت جگائے ایک زمانہ بیت گیا
آنسوں کو پروان چڑھائے ایک زمانہ بیت گیا

اب کیا ہم کو دورِ زمانہ ہوش میں لائے گا ساقی
ہم کو شاید ہوش میں آئے ایک زمانہ بیت گیا

عہدِ بہاراں، جوشِ جوانی، کُنجِ گلستاں، تنہائی
چاندنی راتیں اور دو سائے ایک زمانہ بیت گیا

دل کر ڈھارس دینے والے اب اتنی تکلیف نہ کر
اس گھر میں قندیل جلائے ایک زمانہ بیت گیا

آؤ عدمؔ پھر سندر سندر موتیوں سے پیار کریں
اُجلے اُجلے دھوکے کھائے ایک زمانہ بیت گیا

وقت اُس حسیں کے پاس کچھ اتنا قلیل تھا
قصّہ اک آہ میں بھی سمٹ کر طویل تھا

عہدِ بہار تھا کہ کوئی وحشتِ حسیں؛
جس پھول کو ٹٹول کے دیکھا علیل تھا

موت آئی اور دیکھ کے واپس چلی گئی!
جو تھا وہ زندگی کی ادا کا قتیل تھا

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا؛
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

سمجھی نہ گو کسی نے مری بات اے عدمؔ
میرا سکوت حرفِ خرد کی دلیل تھا

○

دنیا کی وسعتوں پہ بڑا اعتماد تھا
دیکھا تو کائنات کو ہم سے عناد تھا

تھی ارضِ میکدہ کی ہوا کچھ سکون بخش
اُس سے پرے جو تھا، وہ جہانِ فساد تھا

اُس گیسوئے سیاہ نے تاریک کر دیا
ورنہ مرا نصیب ستارہ نژاد تھا

ساغر گرا تھا ایک مشیّت کے ہاتھ سے
کیا علم تھا کہ میرا دلِ نامراد تھا

محشر میں اتّفاق سے آیا نہ ذہن میں
ورنہ تمام عمر ترا نام یاد تھا!

ہستی کے آئینے میں گماں کا وجود تھا
میں تھا کہ اِک تبسّمِ چشمِ حسود تھا

کلیوں نے مسکرا کے جگر چاک کر لیا!
پھولوں کے پاس صرفِ فریبِ نمود تھا

زاہد کی شکل دیکھ کے یزداں بھی ہنس پڑا
مہمل سا اک صحیفۂ حمد و درُود تھا

اُڑتے ہی پھول رنگ بھی غائب تھا ساتھ ہی
ثابت ہُوا لباس نہیں تھا، وجود تھا

بن بن کے ٹوٹتے رہے مجبوریوں کے دم
کیا دلفریب سلسلۂ ہست و بود تھا

سود و زیاں ضدوں کے تعیّن کا حُسن تھا
یہ حسن مٹ گیا تو زیاں تھا نہ سود تھا

ہستی شباب کی تفسیر کے لئے
تصویر کا لباس بھی ننگِ وجود تھا

آزادیٔ ضمیر کا جھگڑا نیا نہیں
روزِ ازل بھی کوئی حریفِ سجود تھا!

ہر خوب صورتی مرا ایمان تھی عدمؔ!
ہر شعبدے پہ مجھ کو گمانِ وجود تھا

جس دل میں تیری چشمِ کرم نے نہ گھر کیا
اس دل کو حادثات نے زیر و زبر کیا

ہم تو بڑھا رہے تھے تعلّق حیات سے
پر زندگی نے بات کو کیا مختصر کیا

کانٹے کی نوک فرطِ حسد سے نہ جل اُٹھے
مت پوچھ ہم نے زیست کو کیسے بسر کیا

دنیا تو لے کے آئی تھی کچھ قیمتی شراب
ہم نے نہ اعتبارِ فریبِ نظر کیا

کی زندگی نے اس طرح تسکین کی تلاش
دیوانگی نے خواب میں جیسے سفر کیا،

ہستی کے اعتبار کی غارت گری نہ پوچھ،
ہستی کا اعتبار عدمؔ عمر بھر کیا

○

دل تھا کہ پھول بن کے بکھرتا چلا گیا
تصویر کا جمال ابھرتا چلا گیا

شام آئی اور آئی کچھ اس اہتمام سے
وہ گیسوئے دراز بکھرتا چلا گیا

اُن مست انکھڑیوں کے اشارے کی دیر تھی
مفہوم زندگی کا نکھرتا چلا گیا

غم کی لکیر تھی کہ خوشی کا اُداس رنگ
ہر نقش آئینے میں اُبھرتا چلا گیا

ہر چند راستے میں تھے کانٹے بچھے ہوئے
جس کو تری طلب تھی گزرتا چلا گیا

جب تک تری نگاہ نے توفیق دی مجھے
میں تیری زلف بن کے سنورتا چلا گیا

دو ہی تو کام تھے دلِ ناداں کو اے عدمؔ
جیتا چلا گیا، کبھی مرتا چلا گیا

○

اِس بے رُخی سے عہدِ جوانی گزر گیا
جیسے کہ جوئبار کا پانی گزر گیا

جو بھی رہِ حیات سے گزرا وہ بدنصیب
کہتا ہُوا غموں کی کہانی گزر گیا

یوں تو نہ تھا خموش مرا سازِ زندگی
شاید کہ عہدِ نغمہ فشانی گزر گیا

تصویر بن کے آنکھ کی پُتلی بکھر گئی
انگڑائی لے کے خوابِ جوانی گزر گیا

رنگین ساعتوں کی شکایت ہی کیا عدمؔ
پانی کا ایک سیل تھا، پانی گزر گیا!

پھیلا تو بدر، اور گھٹا تو ہلال تھا
جو نقش تھا وہ اپنی جگہ بے مثال تھا

تصویر میں بھی تہمتِ ہستی کی شکل تھی
میں عالمِ خیال میں بھی پائمال تھا

آغوش میں گرا تھا کوئی اتنا یاد ہے!
پھر اس کے بعد جو تھا وہ خواب و خیال تھا

رنگین صورتوں کی حقیقت نہ پوچھیے
دامِ مشاہدہ میں نظر کیا خیال تھا

اب ہم کو ڈھونڈنے کا تکلف نہ کیجیے
ہم کھو گئے کہ آپ کا ملنا محال تھا

ٹوٹی تو زندگی کی عمارت ہی گر گئی
دیکھا تو اعتبارِ نظر بھی محال تھا

جس سمت بھی گیا کوئی ٹھہرا نہ آس پاس
میں تھا عدم کہ ایک گدا کا سوال تھا!

○

خوش ہوں کہ زندگی نے کوئی کام کر دیا
مجھ کو سپردِ گردشِ ایام کر دیا

ساقی سیاہ خانۂ ہستی میں دیکھنا
روشن چراغ کس نے سرِ شام کر دیا

پہلے مرے خلوص کو دیتے رہے فریب
آخر مرے خلوص کو بدنام کر دیا

کس بے تکلفی سے فسانہ نگار نے
آغاز کو بگاڑ کے انجام کر دیا

کتنی دعائیں دوں تری زلفِ دراز کو
کتنا وسیع سلسلۂ دام کر دیا

وہ چشمِ مست کتنی خبردار تھی عدمؔ
خود ہوش میں رہی، ہمیں بدنام کر دیا

ناؤ سے طوفان جب ٹکرا گیا
میں نے یہ سمجھا کہ ساحل آ گیا

میری بے کیفی کا عالم دیکھ کر
ہر طرف رنگین بادل چھا گیا

بجھ گیا ایسے غمِ ہستی سے دل
آئینے کو زنگ جیسے کھا گیا

جا رہا تھا میں نہ جانے کس طرف
جاتے جاتے میکدے کو آ گیا

ہنس پڑی تھی سادگی سے اک کلی
گلستاں کا گلستاں مرجھا گیا

زندگی کا رنگ اتنا زرد تھا
میں تری آنکھوں کا دھوکا کھا گیا

میکدے کا راستہ، شام اور عدمؔ
صبح کا بھولا ہُوا گھر آ گیا!

○

مری جان اتنی نہ تکلیف فرما
ذرا اپنی زلفوں کی تالیف فرما

محبت کا دم آگیا ہے لبوں پہ
تغافل میں تھوڑی سی تخفیف فرما

حقیقت بڑی تلخ ہے زندگی کی —
فسانے نہ بے سود تصنیف فرما

گھڑی دو گھڑی کا تماشا ہے دنیا
گھڑی دو گھڑی اور تشریف فرما

عدمؔ ہوش کو جام میں غسل دے کر
ذرا چشمِ ساقی کی تعریف فرما

○

سویرے سویرے ترا نام لینا
لرزتے ہوئے ہاتھ میں جام لینا

نہ جانے زمانے کو کیا ہو گیا ہے
نہ آرام دینا، نہ آرام لینا

جوانی کے دن ہیں کہ پھولوں کے گجرے
ذرا بوسۂ زلفِ ایام لینا

غمِ زیست میں رنگ بھرنے کی خاطر
کبھی ساز اُٹھانا، کبھی جام لینا

خراماں خراماں کوئی آ رہا ہے
تدبّر سے اے ہمنشیں کام لینا

مری وحشتوں کو ذرا روک رکھنا
مری لغزشوں کو ذرا تھام لینا

بیانِ عدمؔ سے کوئی شعر پڑھنا
کسی میکدے کا ذرا نام لینا

○

صراحی سے کچھ لے کے جب جام آیا
طبیعت کو تھوڑا سا آرام آیا

مجھے تہمتِ بیخودی دینے والے
تری آنکھ پر بھی تو الزام آیا

کوئی چیز چبھنے لگی میرے دل میں
لبِ غیر پر جب ترا نام آیا

ارے داستاں گو یہ کیا ماجرا تھا
نہ آغاز آیا نہ انجام آیا

نہ جانے ہوا کیا مرے نامہ بر کو
نہ پیغام پہنچا، نہ پیغام آیا

غمِ زندگی سے ہی کچھ دوستی تھی
غمِ زندگی ہی عدم کام آیا

○

سبُو سے رواں جب عرق ہو گیا
خرامِ زمانہ شفق ہو گیا

کلی ایک وحشت سے یوں ہنس پڑی
کہ ہر پھول کا رنگ فق ہو گیا

ہوئی جب مرتّب خرد کی کتاب
جنوں زینتِ سر ورق ہو گیا

پریشانیاں دیکھ کر زیست کی
ہمیں مسکرانے کا حق ہو گیا

خرد تو ہمیں لے چلی تھی عدمؔ
جنوں زندگی کی رمق ہو گیا

○

تری نگاہ نے اتنا تو کر دیا ہوتا
غمِ حیات میں کچھ رنگ بھر دیا ہوتا

اب آپ کس لئے اتنے ملول ہوتے ہیں
دیا تھا رنج تو کچھ سوچ کر دیا ہوتا

کوئی سلوک تو ہم کو بھی یاد رہ جاتا
کوئی فریب تو جی کھول کر دیا ہوتا

شبِ فراق اور اتنی دراز اے پیارے
دراز تھی تو سحر خیز کر دیا ہوتا

خرد سے کام نہ لیتے عدمؔ اگر ہم لوگ
غمِ حیات نے برباد کر دیا ہوتا

نہ پوچھ کتنا سرور آفریں جواب ملا
دعا سکون کی مانگی بھی اضطراب ملا

تری تلاش مری جان، اور دشتِ حیات
سفر تو خوب تھا، رستہ بہت خراب ملا

ہمیں تو حشر سے پہلے بھی اُس کے کوچے میں
قریب آکے کئی بار آفتاب ملا

مجھے تو خیر تمنا تھی زہر نوشی کی
تمھیں بھی ایک دھڑکتا ہوا شباب ملا

مرا نصیب تھا یا رات کا کوئی حصّہ،
جہاں ملا بڑی راحت سے محوِ خواب ملا

رہِ حیات کا وہ موڑ میکدہ تھا عدمؔ
جہاں کبھی نہ کبھی کوئی ماہتاب ملا

○

لگی تھی آنکھ کہ اُن انکھڑیوں کا خواب آیا
جہاں قیام کیا ساغرِ شراب آیا
شبِ وصال نہ وہ تھے، نہ ہم، نہ کون و مکاں
جو اُس کو یہ گماں تھا کہ کوئی خواب آیا
کچھ اتنی مفلس و نادار تھی حقیقتِ زیست
نگاہ جھوم اٹھی جب کوئی سراب آیا
طلوعِ حشر سے پہلے نہ ہو سکی تصدیق
سُنا تو تھا کہ کسی شوخ پر شباب آیا
طلب تو جام کیا تھا مگر نہ کر دریافت
شراب خانۂ ہستی سے کیا جواب آیا
شبِ سیاہ کے دامن میں اُونگھنے والو
اٹھو اٹھو کہ پیالوں میں آفتاب آیا
یہ کس نگاہ کی بجلی گری ہے مستوں پر
یہ کس طرف سے عدم ساغرِ شراب آیا

○

دل ڈوب نہ جائیں پیاسوں کے، تکلیف ذرا فرما دینا
اے دوست کسی میخانے سے کچھ زیست کا پانی لا دینا

طوفانِ حوادث سے پیارے کیوں اتنا پریشاں ہوتا ہے
آثار اگر اچھّے نہ ہوئے، اک ساغرِ مے چھلکا دینا

ظلمات کے جھرمٹ ویسے تو بجلی کی چمک سے ڈرتے ہیں
پر بات اگر کچھ بڑھ جائے، تاروں سے سبُو ٹکرا دینا

ہم حشر میں آتے تو ان کی تشہیر کا باعث ہو جاتے
تشہیر سے بچنے والوں کو، یہ بات ذرا سمجھا دینا

میں پیرہنِ ہستی میں بہت عریاں سا دکھائی دیتا ہوں
اے موت مری عریانی کو ملبوسِ عدم پہنا دینا

○

تہی سا جام تو تھا، گر کے بہہ گیا ہوگا
مرا نصیب ازل میں ہی رہ گیا ہوگا

ہے اہرمن سے نہ معلوم کیوں خفا یزداں
غریب کوئی کھری بات کہہ گیا ہوگا

ہم اور لوگ ہیں ہم سے بہت غرور نہ کر
کلیم تھا جو ترا ناز سہہ گیا ہوگا

حضور آپ کی آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
مرا خلوص مرا حال کہہ گیا ہوگا

وہ ایک ریزۂ سیماب جس کا نام ہے دل
مرا خیال ہے مدت کا بہہ گیا ہوگا

قریب کعبہ پہنچ کر عدم کو مت ڈھونڈو!
وہ حیلہ جو کہیں رستے میں رہ گیا ہوگا

○

زباں پر آپ کا نام آ رہا تھا
غمِ ہستی کو آرام آ رہا تھا

خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیا
ہماری سمت پیغام آ رہا تھا

خدا کا شکر تیری زلف بکھری
بڑی گرمی کا ہنگام آ رہا تھا

ستارے سو گئے انگڑائی لے کر
کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا

تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا

عدمؔ دل کھو کے آسودہ نہیں ہم
بُرا تھا یا بھلا! کام آ رہا تھا

○

سر رہ گیا ہے دوش پہ اور دل نہیں رہا
کیا اس جہان میں کوئی قاتل نہیں رہا

اے چشمِ یار اب نہ تغافل نہ التفات
کیا میں کسی سلوک کے قابل نہیں رہا

کیوں اُس کو میرے دل سے عبارت کرے کوئی
وہ آئینہ جو تیرے مقابل نہیں رہا

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر
ہم فرض کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا

پردہ اُٹھا کہ اب مری مستی ہے، میں نہیں
جس سے تجھے حیا تھی وہ حائل نہیں رہا

کچھ تو ترے خلوص کی تعظیم تھی عدمؔ
ورنہ وہ جان بوجھ کے غافل نہیں رہا

بھٹک گئے کہ ہمیں راہ کا شعور نہ تھا
حریمِ ناز ترا اور نہ اتنی دور نہ تھا

ازل کے دن بھی بصارت کی کیفیت تھی یہی،
شراب پینے سے پہلے نظر میں نور نہ تھا

تری نگاہ کو دیکھا تھا رقص کرتے ہوئے
ہجومِ لغزشِ مستی مرا قصور نہ تھا

دلِ خراب کی بدمستیوں کا حال نہ پوچھ
ترے حضور تھا لیکن ترے حضور نہ تھا

عدمؔ یہ راز بڑی دیر سے کھلا ہم پر
وہ جام جام نہیں تھا جو چور چور نہ تھا

○

اٹھی ہے جھوم کے کالی گھٹا جواب تو لا
ذرا خمار تو برسا، ذرا شراب تو لا

غمِ حیات نے پھر آج دل دکھایا ہے
ذرا سی ہو سکے اس وقت دستیاب تو لا

وہ آفتاب جو شب کو طلوع ہوتا ہے
تلاش کر کے کہیں سے وہ آفتاب تو لا

صدائے قلقلِ مینا بھی ایک نغمہ ہے
مرے حسین مغنّی ذرا رباب تو لا

میں بھول جاؤں نہ مفہومِ زندگی ساقی!
ذرا چھلکتا ہُوا ساغرِ شراب تو لا

سحاب جھوم رہا ہے ذرا رباب تو چھیڑ
بہار ناچ رہی ہے ذرا شراب تو لا

میں لے کے آیا ہوں خوابِ عدم کی رعنائی،
مگر تو اپنا ذرا عالمِ خراب تو لا!

اس طرف بھی دیکھ او مستِ شباب
دیکھنے والوں کی حالت ہے خراب!

زیست کا مفہوم پوچھا تھا کہ بس
چھپ گیا اک آہ بھر کر آفتاب!

تیری چشمِ بدگماں کا کیا گلہ!
زندگی کی ہر حقیقت ہے سراب!

کاٹنے ہیں چند دن تکلیف کے
صبر بھی کر او دلِ خانہ خراب!

چبھ گیا تھا کیا دلِ بیمار میں
بوند تھی شبنم کی، یا برگِ گلاب

میکدے کی قید کیا اے مہ جبیں
تیری آنکھوں میں بھی رخشاں ہے شراب

جام اُٹھا کس سوچ میں گم ہے عدمؔ
مسکراہٹ ہے حوادث کا جواب

○

زندگی ہے کہانیوں کی کتاب
ٹوٹ جائے نہ گر کے جامِ شراب

اپنی صورت کو دیکھنے والے!
کیسی کیسی حقیقتیں ہیں سراب

کھینچ ایسی بہار کی تصویر،
جس کا عنوان ہو خزاں کا شباب

نہ کوئی حادثہ، نہ پیمانہ!
کیا ہُوا تجھ کو عالمِ اسباب

مجھ کو بھی اک حسیں سے ملنا ہے!
میں بھی چلتا ہوں اے شبِ مہتاب

تلخ ہے زندگی کی موسیقی!!
ٹوٹ جائے عدم نہ دل کا رباب

○

دل کے معاملات ہیں سُود و زیاں کی بات
ایسی ہے جیسے موسمِ گُل میں خزاں کی بات

اچھا! وہ باغِ خلد جہاں رہ چکے ہیں ہم!
ہم سے ہی کر رہا ہے تو زاہد وہاں کی بات

جاؤ تمھیں نہ میرے نفس کی ہوا لگے!
کیا پوچھتے ہو راہرؤ کارواں کی بات

نیرنگیٔ زمانہ کا چہرہ اُتر گیا!
چھیڑی تھی ہم نے شوخیٔ عمرِ رواں کی بات

زاہد ترا کلام بھی ہے با اثر، مگر!
پیرِ مغاں کی بات ہے پیرِ مغاں کی بات

○

اک زخم تھا کہ وقت کے ہاتھوں سے بھر گیا
کیا پوچھتے ہیں آپ کسی مہرباں کی بات

ہر بات زلفِ یار کی مانند ہے دراز!
جو بات چھیڑتے ہیں وہ ہے داستاں کی بات

سر کی سلامتی کوئی ایسی خطا نہیں!
کیوں چھیڑتے ہیں لوگ ترے آستاں کی بات

اُٹھ کر تری گلی سے کہاں جائیں اب فقیر!
تیری گلی کے ساتھ ہے اب جسم و جاں کی بات

باتیں اِدھر اُدھر کی سنا کر جہان کو
وہ حذف کر گئے ہیں عدم درمیاں کی بات

○

لطف کی گفتگو، قرار کی بات
کیجیے آج کوئی پیار کی بات

کر رہے ہیں پہنچ کے منزل پر
کس لیے لوگ رہگزار کی بات

آگیا رنگ اُس کی آنکھوں میں
بن گئی موسمِ بہار کی بات

اپنے دل پر بھی بس نہیں چلتا
اس کو کہتے ہیں اختیار کی بات

ٹوٹ جائے تو پھر نہیں آتا
ہے کچھ ایسی ہی اعتبار کی بات

کیا ہوا بات کرنے والوں کو
کر رہے تھے خرامِ یار کی بات

زندگی کے قمار خانے میں
ہوتی رہتی ہے جیت ہار کی بات

رات کیسے کٹے گی اے مطرب
نہ کوئی زمزمہ، نہ پیار کی بات

ذکر اور وہ بھی چاندراتوں کو
بات اور وہ بھی زلفِ یار کی بات

ہم فقیروں سے بھی عدمؔ اکثر
لوگ کرتے ہیں کاروبار کی بات

○

جام بھر دے تکلّفات نہ کر
ہم فقیروں سے ایسی بات نہ کر
تیری آنکھوں سے آشنا ہیں ہم
زحمتِ چشمِ التفات نہ کر
دل بڑی نرم چیز ہوتی ہے
اس قدر بے رُخی سے بات نہ کر
رنجشیں مستقل نہیں ہوتیں!
دیکھ! قطعِ تعلّقات نہ کر
ہم کو فرصت نہیں ہے سننے کی
اے غمِ روزگار! بات نہ کر
اتنا سنگیں کوئی گناہ نہیں
اے عدمؔ خونِ خواہشات نہ کر

○

دل ہے۔ بڑی خوشی سے اسے پائمال کر
لیکن ترے نثار ذرا دیکھ بھال کر

اتنا تو دل فریب نہ تھا دامِ زندگی
لے آئے اعتبار کے سانچے میں ڈھال کر

ساقی مرے خلوص کی شدّت کو دیکھنا
پھر آگیا ہوں گردشِ دوراں کو ٹال کر

اے دوست تیری زلفِ پریشاں کی خیر ہو
میری تباہیوں کا نہ اتنا خیال کر

آیا ہوں یوں بچا کے حوادث سے زیست کو
لاتے ہیں جیسے کوہ سے چشمہ نکال کر

تھوڑے سے فاصلے میں بھی حائل ہیں لغزشیں
ساقی سنبھال کر، مرے ساقی، سنبھال کر

ہم سے عدؔم چھپاؤ تو خود بھی نہ پی سکو
رکھا ہے تم نے کچھ تو صراحی میں ڈال کر

○

یہ اعتبار کر لیا کسی فریب کار پر
کہ بار بار ہنس رہا ہوں اپنے اعتبار پر

خزاں بھی ایک رنگ ہے، اُداس سی اُمنگ ہے
نظر تو ڈال لیجئے ذرا لُٹی ہوئی بہار پر

بغل میں کچھ لئے ہوئے، مگن مگن پئے ہوئے
گئے ہیں آپ بھی کبھی کنارِ جوئبار پر

یہ تمکنت یہ زندگی، یہ موت کی درندگی
غلاف سا چڑھا ہوا ہو جس طرح مزار پر

منجھی ہوئی کہانیاں، بھری ہوئی جوانیاں
شراب کی روانیاں رواں ہے لالہ زار پر

ہر اک شریف آدمی گناہ گار ہو گیا!
یقین ہی نہیں انھیں کسی گناہ گار پر

یہ مہ وشوں کی بولیاں، یہ شاعروں کی ٹولیاں
کھنک رہی ہیں بوتلیں عدمؔ مرے مزار پر!

○

گردشِ روزگار کو حلقۂ زلفِ یار کر
بات بہت طویل ہے، بات کا اختصار کر

بات تھی، اتفاق سے لب پہ مچل کے آگئی
بات کا ذکر چھیڑ کر اور نہ شرمسار کر

عینِ نماز ہے یہی، شرحِ نیاز ہے یہی!
اُجڑے دلوں میں گھر بنا، ٹوٹے دلوں سے پیار کر

فتنۂ حشر کو ذرا اذنِ خرام بخش دو
زلفِ دراز کھول کر، نوکِ پلک سنوار کر

دردِ حیات ڈس گیا، روح میں زہر بس گیا
یا مرا جام توڑ دے، یا مجھے برقرار کر

میں ترے انتظار میں جانے کہاں پہنچ گیا
تو بھی طلوعِ حشر تک اب مرا انتظار کر

کس کی خطا ہے اے صنم، تہمتِ ہستی و عدم
اپنی جفاؤں کا ذرا آپ ہی تو شمار کر

○

ہر شخص سے نہ اس طرح ہنس کر کلام کر
میرا نہیں تو اپنا ہی کچھ احترام کر

کیوں دے رہا ہے عشق کا سودا کلیم کو
یہ تہمتِ حسیں کسی انساں کے نام کر

دیر و حرم نہیں تو خرابات ہی سہی
اے گردشِ زمانہ کہیں تو قیام کر

ہے فصلِ گل میں رسمِ عبادت کا اور رنگ
مے پی کے فرشِ سبزہ و گل پر خرام کر

دن تو کسی طرح سے نکل ہی گیا عدم
شام آ رہی ہے مردِ خدا فکرِ شام کر

○

پی رہے ہیں، پلا رہے ہیں لوگ　　جشنِ مستی منا رہے ہیں لوگ
میری الفت کا تذکرہ کر کے　　تیری قیمت گھٹا رہے ہیں لوگ
بندہ پرور یہ ماجرا کیا ہے؟　　کس لیئے مسکرا رہے ہیں لوگ
بادہ خواروں کو ٹوکنے والے!　　راہ میں لڑکھڑا رہے ہیں لوگ
کتنی رونق ہے تیرے کوچے میں　　جوق در جوق آ رہے ہیں لوگ
ہم غریبوں کو دیکھ کر خاموش　　کتنی باتیں بنا رہے ہیں لوگ
موت کا رنگ اُڑتا جاتا ہے　　سازِ ہستی بجا رہے ہیں لوگ

آ گئی ہے عدمؔ مریض کو نیند
ختم ہے کھیل، جا رہے ہیں لوگ

کتنا بدنام ہو گیا ہے دل
ایک دشنام ہو گیا ہے دل

ہر گلی میں خراب ہوتا ہے
کس قدر عام ہو گیا ہے دل

گردشِ روزگار سے کہہ دو!
گردشِ جام ہو گیا ہے دل

حسنِ آغاز تھی نگاہ تری
داغِ انجام ہو گیا ہے دل

اب نہ دھڑکے گا صبحِ محشر تک
محوِ آرام ہو گیا ہے دل

اے عدمؔ اب نظر نہیں آتا
تیرا ہم نام ہو گیا ہے دل

○

رستہ اُداس اُداس ہے آنچل اڑا کے چل
اے جانے والے خیر تری مسکرا کے چل
کرتا ہے کون بادِ خزاں سے موافقت
مجھ خانماں خراب سے دامن بچا کے چل
میں راستے کا بوجھ ہوں میرا نہ کر خیال
تو زندگی کی لہر ہے لہریں اُٹھا کے چل
لازم ہے میکدے کی شریعت کا احترام
اے دورِ روزگار ذرا لڑکھڑا کے چل
اے دوست تھک گیا ہے تو جنگل میں بیٹھ جا
اور سازِ زندگی پہ کوئی گیت گا کے چل
تو اور میکدے کی یہ ٹھنڈی ہوا قدم
اے خوش نصیب روح میں ٹھنڈک بسا کے چل

○

لوگوں سے نہ اتنا مل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں،
اِک پھول ہے تیرا دِل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں

غنچے کی طرح جو کھلتے ہیں کچھ دیر میں مرجھا جاتے ہیں
غنچے کی طرح مت کِھل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں

رفتارِ زمانہ نے ہم کو پہلے ہی فنا کر رکھا ہے
مت توڑ ہمارا دِل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں

ہم بھی تو زمانہ سازوں کی بستی ہی کے رہنے والے ہیں
ہم سے بھی نہ اتنا مل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں

کس وقت سے تو میخانے میں بیٹھا ہے عدمؔ کچھ غور تو کر!
اب کوئے مغاں سے ہِل پیارے، رفتارِ زمانہ ٹھیک نہیں

○

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

زندگی کے حسین ترکش میں،
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

پھول دامن میں چند رکھ لیجیے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

تیری محفل میں بیٹھنے والے
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

اے عدمؔ احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں!

○

رقصِ میخانہ بہار رہوں میں
تیری آنکھوں کا اعتبار رہوں میں

بات کو کیوں طویل کرتے ہو
کہہ چکا ہوں کہ شرمسار رہوں میں

تم سے ملنے کی اتنی خواہش ہے
بے سبب محوِ انتظار رہوں میں

میرا وعدہ تری نگاہ نہیں
اپنے وعدے پہ برقرار رہوں میں

کیوں زمانہ مٹا رہا ہے مجھے
برگِ گل ہوں نہ نوکِ خار رہوں میں

میری تصویر دیکھنے والو
کس کی زلفوں کا انتشار رہوں میں

داورِ حشر یہ تکلف کیوں؟
آدمی ہوں گناہ گار رہوں میں

اے عدم کیا حسین تہمت ہے
لوگ کہتے ہیں بادہ خوار رہوں میں

○

اہتمامِ بہار کرتے ہیں
آپ کا اعتبار کرتے ہیں

دل کی وحشت کا کیا علاج کریں
پیار آتا ہے۔ پیار کرتے ہیں

آپ جب محوِ خواب ہوتے ہیں
ہم ستارے شمار کرتے ہیں

اور ہو گا کوئی، حضور نہ تھے،
جائیے اعتبار کرتے ہیں

سیرِ گلشن میں کیا برائی ہے
آپ کو پھول پیار کرتے ہیں

تیری صورت کو دیکھنے والے
اپنی آنکھوں کو پیار کرتے ہیں

زیست کو آج زہر دے کے عدمؔ
موت کو شرمسار کرتے ہیں،

○

ہم سے گو دُور دور رہتے ہیں
دل میں لیکن ضرور رہتے ہیں

لوگ اتنے قصور کر کے بھی !
کس طرح بے قصور رہتے ہیں

اس لئے دیکھ بھال کرتا ہوں
آئینے میں حضور رہتے ہیں

میں زمیں پر تلاش کرتا ہوں
وہ ستاروں سے دور رہتے ہیں

میری تشنہ مزاجیوں میں عدم
میکدے کے سرور رہتے ہیں

○

زندگی کا ساز بن جاتا ہوں میں
درد کی آواز بن جاتا ہوں میں

تیری انگڑائی کا عالم دیکھ کر
عالمِ پرواز بن جاتا ہوں میں

یا تری آواز سن سکتا نہیں
یا تری آواز بن جاتا ہوں میں

ختم کر دیتے ہیں جب قصّے کو وہ
بات کا آغاز بن جاتا ہوں میں

میں تو اپنے حال پر خاموش ہوں
تم کہو تو ساز بن جاتا ہوں میں

اے عدم خاموش ہو جاتا ہوں جب
سازِ بے آواز بن جاتا ہوں میں

○

گھر کے اندر صاحبِ خانہ نہیں
اتنا دلکش کوئی ویرانہ نہیں

اپنے اپنے حال میں سب مست ہیں
بندہ پرور کوئی دیوانہ نہیں

احتیاط اے شمعِ محفل احتیاط
تیری رسوائی ہے، پروانہ نہیں

ہے ذرا سا وقت تو سُن لیجئے
بات ہے چھوٹی سی، افسانہ نہیں

بے تکلّف کیوں چلے آتے ہیں آپ
بندہ پرور، دل ہے، بت خانہ نہیں

کیا قرار آئے طبیعت کو عدمؔ
دورِ گردِ دل، دورِ پیمانہ نہیں

○

کوئی جام پی لوں، کوئی کام کر لوں
ذرا چارۂ جورِ ایام کر لوں،

مرے نام کو مشتہر کرنے والے
ترے نام کو بھی تو بدنام کر لوں

اُتر آؤ، اے آسماں کے ستارو
تمھیں چوم کر زینتِ جام کر لوں

مجھے دعوتِ ابتدا دینے والے
ٹھہر جا! ذرا فکرِ انجام کر لوں

بہت تھک گیا ہوں سفر کرتے کرتے
کسی سبز گوشے میں آرام کر لوں

خدا کو عدمؔ منہ دکھانا ہے اک دن
جوانی میں کچھ ذکرِ اصنام کر لوں

○

نقوشِ دل پریشاں ہو رہے ہیں
غموں کے شہر ویراں ہو رہے ہیں

کسی کے نین بھیگی چاندنی سے
گلستاں در گلستاں ہو رہے ہیں

بہار آئے گی اب کیا گلستاں میں
ترے گیسو پریشاں ہو رہے ہیں

ابد تک سلسلہ جاری رہے گا
ازل سے عہد و پیماں ہو رہے ہیں

جو غنچے شاخ پر مرجھا گئے ہیں
وہ تصویروں کے عنواں ہو رہے ہیں

اِدھر آؤ تماشا ہے غضب کا
سفینے غرقِ طوفاں ہو رہے ہیں

عدمؔ کیوں اُڑ رہا ہے رنگِ ہستی
کہاں کے ساز و ساماں ہو رہے ہیں

تالیفِ نگاہ کر رہا ہوں
چھوٹا سا گناہ کر رہا ہوں

کانٹے ہی دیئے ہیں زندگی نے
کانٹوں سے نباہ کر رہا ہوں

اُس زلف سے پیار ہو گیا ہے
راتوں کو سیاہ کر رہا ہوں

دنیا کو ہوس ہے روشنی کی
تقسیمِ نگاہ کر رہا ہوں

کیا اور ثبوت دوں وفا کا
تم سے بھی نباہ کر رہا ہوں

کھاتا ہوں عدمؔ فریبِ ہستی
بس اتنا گناہ کر رہا ہوں

○

سن کر تری نگاہ کی رنگیں حکایتیں،
چپ ہو گئی ہیں دیر و حرم کی روایتیں

کتنی عجیب شے ہے محبت کی سادگی
دنیا سے کر رہا ہوں تمھاری شکایتیں

جب سے گئے ہیں آپ غریبوں سے روٹھ کر
مسدود ہو گئی ہیں خدا کی عنایتیں،

ہم کو سکونِ دل کی طلب تھی مگر خرد
لے آئی جمع کر کے شگفتہ روایتیں

چپ ہو گیا ہوں آپ کی صورت کو دیکھ کر
کرنی تھیں آپ سے مجھے کتنی شکایتیں

غمہائے روزگار پہ ہنستے ہیں اے عدمؔ
حاصل ہیں جن کو اُن کی نظر کی حمایتیں،

○

مستی میں اُس حسیں کو خدا کہہ گیا ہوں میں
پھر بھی جو کہہ گیا ہوں، بجا کہہ گیا ہوں میں

کچھ تو مرے گناہ کی عظمت پہ غور کر!
اپنی خطا کو تیری رضا کہہ گیا ہوں میں

کیوں دیکھتے ہیں غور سے میکش مری طرف
ساقی تری نگاہ سے کیا کہہ گیا ہوں میں

چاہا ہے جب کہ تیری وفا کا ثبوت دوں
اپنے خلوص کو بھی ریا کہہ گیا ہوں میں

اس آس پر کہ بھیک ملے زندگی کی کچھ،
تیرے لبوں کو آبِ بقا کہہ گیا ہوں میں

لو اب بتاؤ مے کو کہے گا حرام کون
دنیا کو میکدے کی ہوا کہہ گیا ہوں میں

یا رب مرے خلوص کی وارفتگی تو دیکھ!
کس سادگی سے تجھ کو خدا کہہ گیا ہوں میں

مطرب ترے رباب کا دل تو نہیں دکھا
نغمے کو اعتبارِ نوا کہہ گیا ہوں میں

تم نے سنا ہے کچھ تو سماعت میں تول لو
مجھ کو تو کچھ خبر نہیں کیا کہہ گیا ہوں میں

پھولوں کی آبرو کہیں غیرت سے اُڑ نہ جائے
کلیوں کی سادگی کو حیا کہہ گیا ہوں میں

آیا ہوں بخشنے پہ جب اعزاز اے عدم
ہر راہزن کو راہنما کہہ گیا ہوں میں

○

پہلو میں دل نہیں کہ دہن میں زباں نہیں
چپ ہوں کہ بات کرنے کا کوئی سماں نہیں

اس وقت آپ کونسی حجت کریں گے پیش
اِس وقت تو حضور کوئی درمیاں نہیں

کیوں دیکھتا ہے تو مری صورت کو بار بار
اے داستاں سرا یہ مری داستاں نہیں

اے ہم قفس! خدا ترے دل کو سکون دے
میرا تو اس چمن میں کوئی آشیاں نہیں

ملاح سے بگاڑ سراسر فضول ہے
ساحل کا دور دور کہیں تک نشاں نہیں

اے دوست گیسوؤں کو ہوا میں بکھیر دے
محسوس ہو رہا ہے طبیعت رواں نہیں

دو چار روز ہم بھی رہے ہیں بہشت میں
لیکن عدمؔ جو بات یہاں ہے، وہاں نہیں

○

مے پی رہے ہیں لوگ ستاروں کی اوٹ میں
پھولوں کی نکہتوں میں، نگاروں کی اوٹ میں

ہوتے ہیں حادثے اسی نازک مقام پر
آسودگی نہ ڈھونڈھ کناروں کی اوٹ میں

آپ اور خزاں کا موسمِ ویراں، نہیں نہیں
چھپ جائیے! اُداس بہاروں کی اوٹ میں

غمگیں مسافروں کے نصیبوں کا کارواں
ٹھہرا ہُوا ہے راہگزاروں کی اوٹ میں

دیکھو تو اس کی جنبشِ مژگاں کو، اے عدمؔ
کتنی کہانیاں ہیں اشاروں کی اوٹ میں

○

اُس گیسوئے دراز کو سلجھا رہا ہوں میں
غمخانۂ حیات کو مہکا رہا ہوں میں

میں اور تیری انجمنِ ناز میں قیام
لے کر تری نظر کو اُٹھا جا رہا ہوں میں

کٹتی نہیں بغیر سہاروں کے زندگی
حالات کے کرم پہ بہا جا رہا ہوں میں

میں اور آئینے کے فرائض کا حوصلہ
شیشہ گروں کے ظلم سے شرما رہا ہوں میں

نا آشنائے تلخیٔ سازو سبو نہیں
یونہی ذرا مزاج کو بہلا رہا ہوں میں،

نقّاش کے مزاج کی تفریح کے لئے
تصویر کے عیوب کو چمکا رہا ہوں میں

کس وہم میں پڑا ہے عدمؔ کاتبِ عمل
جو کچھ بھی ہوں خدا کو نظر آ رہا ہوں میں

○

آتا ہے کون درد کے ماروں کے شہر میں
رہتے ہیں لوگ، چاند ستاروں کے شہر میں

ملتا تو ہے خوشی کی حقیقت کا کچھ سراغ
لیکن نظر فریب اشاروں کے شہر میں

اُن انکھڑیوں کو دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں
ہم آبسے ہیں بادہ گُساروں کے شہر میں

اے دل ترے خلوص کے صدقے! ذرا سا ہوش
دشمن بھی بے شمار ہیں، یاروں کے شہر میں

دیکھیں عدمؔ نصیب میں ہے کیا لکھا ہوا
دل بیچنے چلے ہیں نگاروں کے شہر میں

○

اُن مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے!
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اُس حرفِ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے، اے مرگِ ناگہاں!
اُس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدمؔ کس گریز سے
اُس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

○

اے دوست، دل کا ساز بجانے لگا ہوں میں
بس آخری چراغ جلانے لگا ہوں میں

کتنا خمار ہے تری چشمِ سیاہ میں!
انگڑائی لے کے ہوش سے جانے لگا ہوں میں

..... تکمیلِ میکشی کے لئے زہر شرط ہے
اے چارہ ساز آگ بجھانے لگا ہوں میں

دنیا پہ چشمِ یار کی مستی بکھیر کر!
دنیا کو دل فریب بنانے لگا ہوں میں

اے دوست اِس کے بعد حکایت ہی ختم ہے
تمثیل پر نقاب گرانے لگا ہوں میں

تدبیر کے خطوط کی صورت بگاڑ کر
تقدیر کا مذاق اڑانے لگا ہوں میں

یوں جامِ مے سے آنکھ ملاتا ہوں اے عدمؔ
جیسے کسی حسیں کو جگانے لگا ہوں میں،

کانٹے چبھو چبھو کے جگایا گیا ہوں میں   کن مشکلوں سے ہوش میں لایا گیا ہوں میں

آپ اور دشمنوں کی صداقت کا اعتراف   میرا خیال ہے کہ چڑھایا گیا ہوں میں

نقاش کے خیال کی الجھن نہیں گئی !   سو مرتبہ مٹا کے بنایا گیا ہوں میں

شاید بنانے والے کو کچھ اس کا علم ہو   کس نقطۂ نظر سے بنایا گیا ہوں میں

اے دوست تیری بزمِ ظرافت پسند میں   کس بے تکلفی سے اڑایا گیا ہوں میں

بے رحم آئینے کی طرح کائنات کو   پہلو بدل بدل کے دکھایا گیا ہوں میں

پھولوں کی باس ہوں نہ ستاروں کی روشنی   کیوں تیری انجمن میں بلایا گیا ہوں میں

شاید مرا خلوص بھی اک جرم تھا عدم
کن حیلہ سازیوں سے بھلایا گیا ہوں میں

○

بڑا خلوص تھا پھولوں کے مسکرانے میں
چمن نے دیر نہ کی کھل کے روٹھ جانے میں

نہ جانے کس کی نظر کو اُداس دیکھا تھا
ہر ایک نقش تھا غمگیں نگار خانے میں

مرے سفینے کا لنگر سنبھالنے والے
ترا تو ہاتھ نہ تھا میرے ڈوب جانے میں

حکایتیں تو ریا سے حسین ہوتی ہیں،
مرے خلوص کو شامل نہ کر فسانے میں

حضور ساغرِ مے اور لبوں تک آ پہنچے،
یہ خواب آپ نے دیکھا تھا کس زمانے میں

جدھر نگاہ گئی، زخم کھا کے لوٹ آئی
عدمؔ سنا تھا بڑا حسن ہے زمانے میں

وہ زندگی کا تبسم جو زہر خند نہیں
تجھے پسند بھی ہو تو مجھے پسند نہیں

مری نگاہ میں بھی کچھ اثر تو ہے لیکن
مری نگاہ تری زلف کی کمند نہیں

ترے وجود سے انگڑائی لے کے نکلے گا
وہ میکدہ جو ابھی بوتلوں میں بند نہیں

بس اتنا علم ہے اربابِ عقل و دانش کو
معاملاتِ محبت کبھی، سود مند نہیں

درِ بہشت سے بہتر ہے بابِ مے خانہ
جو زاہدانِ ریاکار پر بھی بند نہیں

خرد کا زہر عدم موت ہے جوانی کی
وہ خوش نصیب ہے جو مردِ ہوشمند نہیں

○

نظر کی رنگ پرستی ہے مَس کی بات نہیں
گلوں سے پیاس بھی بجھ جائے بس کی بات نہیں

کسی کی زلفِ مسلسل سے عشق کر لیجے!
یہ زندگی ہے برس دو برس کی بات نہیں

تمھاری زلف سے کیوں بدگماں ہیں اہلِ خرد
تمھاری زلف ہے دام و قفس کی بات نہیں

جلائیے نہ اسے اتنی سرد مہری سے!
حضور! دل ہے مرا، خار و خس کی بات نہیں

ہیں اتفاق پہ مبنی یہاں بہت باتیں
ہر ایک بات عدمؔ دسترس کی بات نہیں

○

وہ لمحے جو گزر جاتے ہیں، اکثر بھول جاتے ہیں
صراحی خواب بن جاتی ہے ساغر بھول جاتے ہیں

تجھے اے بزمِ ہستی کون کافر یاد رکھے گا
مسافر راہ کی باتوں کو اکثر بھول جاتے ہیں

نہ جانے ذہن میں کس شخص کی تصویر آئی تھی
مکرّر یاد کرتے ہیں، مکرّر بھول جاتے ہیں

پتہ پوچھے کوئی تیرا تو ہم فرطِ رقابت سے
ترے گھر کو ترے گھر کے برابر بھول جاتے ہیں

عدمؔ یہ بات تو دستور کی حد تک مسلّم ہے
ہم اکثر یاد رکھتے ہیں، وہ اکثر بھول جاتے ہیں

لوگ، ہر بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں
سوچنے والوں کو دیوانہ بنا دیتے ہیں

چھیڑ دیتے ہیں ترے گیسوئے شاداب کا ذکر
چاندنی رات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

پارساؤں کے تقدّس کی کرامات نہ پوچھ
ذکرِ فردوس کو مے خانہ بنا دیتے ہیں

تیری مخمور نگاہوں سے اجازت لے کر
آج ہر سینہ کو میخانہ بنا دیتے ہیں

کتنے نادان ہیں بے رحم پتنگے اے دوست
شمع کو چھیڑ کے پروانہ بنا دیتے ہیں

کچھ غمِ عشق بھی کر دیتا ہے مجنون عدمؔ
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

○

آپ سرکار نہ معلوم کدھر ہوتے ہیں
دن غریبوں کے مصیبت سے بسر ہوتے ہیں

دیکھتا ہے جو مرے گھر کی شگفتہ صورت
ہنس کے کہتا ہے بیابان بھی گھر ہوتے ہیں

ڈوب جاتے ہیں سفینے جہاں چکّر کھا کر
آپ کی خیر! وہی بھید بھنور ہوتے ہیں

ہر دل آویز حقیقت کو سمجھتے ہیں فریب
صاحبِ ہوش بڑے تیز نظر ہوتے ہیں

موت کے اور بھی معقول بہانے ہیں بہت
کس لئے لوگ تری زلف کے سر ہوتے ہیں

شبنمیں گھاس پہ دوزخ زدہ اجسام عدمؔ
حادثے باغ میں یہ شام و سحر ہوتے ہیں

جب ترے نین مسکراتے ہیں
زیست کے رنج بھول جاتے ہیں

کیوں شکن ڈالتے ہو ماتھے پر
بھول کر آ گئے تھے جاتے ہیں

کشتیاں یوں بھی ڈوب جاتی ہیں،
ناخدا کس لئے ڈراتے ہیں

اک حسیں آنکھ کے اشارے پر
قافلے راہ بھول جاتے ہیں

مفلسوں کے دلوں کو مت ٹھکرا
یہ پیالے بھی کام آتے ہیں

حادثہ ہے مری محبّت پر
آپ بھی اب یقین لاتے ہیں

لوگ اپنی ضرورتوں کے لئے
کیسے کیسے فریب کھاتے ہیں

دل کی وحشت کا کیا علاج کریں
اے عدم دل کہیں لگاتے ہیں

○

فیضِ دلچسپیٔ ایّام مجھے یاد نہیں
زندگی کا کوئی آرام مجھے یاد نہیں

گو تکالیف ہزار دل تھیں مگر اے ساقی!
کسی تکلیف کا اب نام مجھے یاد نہیں

گر کے کس ہاتھ سے ٹوٹا تھا اچانک کل رات
ساغرِ بادۂ گلفام مجھے یاد نہیں

اُس نے چھیڑا تو تھا شیریں سا فسانہ کوئی
کیا ہوا اُس کا پھر انجام مجھے یاد نہیں

دل میں جاگا تھا جب احساسِ محبّت کا گداز
کونسی شام تھی، وہ شام مجھے یاد نہیں

میں عدم اور گنہ گارِ مذاقِ ہستی،
دے گیا تھا کوئی الزام مجھے یاد نہیں

○

یہ کیسے آبگینے آ رہے ہیں
ستاروں کو پسینے آ رہے ہیں

سنا ہے مہ جبینوں کو بھی کچھ کچھ
مروّت کے قرینے آ رہے ہیں

مہکتے گیسوؤں کو ساتھ لے کر
جوانی کے مہینے آ رہے ہیں

حسینوں کو طلب ہے میکشی کی
ستارے رنگ پینے آ رہے ہیں

عدمؔ جام آ رہے ہیں میکشوں کے
کہ پھولوں کے سفینے آ رہے ہیں

○

اُس کی زلفوں کی جب چھڑی باتیں
صبحِ محشر سے جا ملی راتیں

اتفاقات ہو گئے تھے..... کچھ!
اب کہاں وہ حسیں ملاقاتیں

کتنی بے کیف ہوتی جاتی ہیں
کاش مرجائیں چاندنی راتیں

وہ جوانی کے بے ریا سجدے
وہ صداقت بھری مناجاتیں

جب بھی بکھرے ہیں اُن کے بالِ عَلَم
آگئی ہیں سیاہ برساتیں!

○

صلائے عام لے کر آ گئی ہیں
گھٹائیں جام لے کر آ گئی ہیں

گئی تھیں ڈھونڈنے اُن کو نگاہیں
مگر الزام لے کر آ گئی ہیں۔

غمِ ہستی کی تکلیفیں بھی اکثر
تمھارا نام لے کر آ گئی ہیں

اُفق تک عنبریں سائے ہیں لرزاں
امنگیں شام لے کر آ گئی ہیں

عدمؔ پھر آج وہ مخمور آنکھیں
مئے گلفام لے کر آ گئی ہیں

خوبیوں کو عیوب کہتے ہیں
کہنے والے بھی خوب کہتے ہیں

رُخ پہ پردہ نہ ڈالیے ہنس کر
اس ادا کو غروب کہتے ہیں

ہم پہ بھی ڈال، اک نظر ایسی
جس کو کشفِ قلوب کہتے ہیں

کیا کریں عرض مدّعا اُن سے
ہر گزارش پہ خوب کہتے ہیں

شبنم و گل کو اہلِ ہوش عدمؔ
خوبصورت عیوب کہتے ہیں

○

صبح پیتے ہیں شام پیتے ہیں
بادۂ لالہ فام پیتے ہیں
موسم و ظرف کے نہیں قائل
بے قیود و قیام پیتے ہیں
اُس کی آنکھیں بھی چاہتی ہیں شراب
میکدے خود بھی جام پیتے ہیں
شیخ جی آپ خلد میں جائیں
مے کدے میں عوام پیتے ہیں
ساقیا مے نہیں تو زہر سہی
یہ بھی ہم لوگ جام پیتے ہیں
زندگی کے شراب خانے میں
بندہ پرور تمام پیتے ہیں
چند شاعر جو مے نہیں پیتے
وہ عدمؔ کا کلام پیتے ہیں

○

کس قدر قیل و قال کرتے ہو
بندہ پرور کمال کرتے ہو

اپنی تفریح کا ہی فکر ہے بس
یا مرا بھی خیال کرتے ہو

جس طرح جانتے نہیں کچھ بھی
کیا انوکھے سوال کرتے ہو

اُن کا مرنا بھی سہل کر جاؤ
جن کا جینا محال کرتے ہو

اے عدمؔ بزمِ حشر ہے۔ بولو
جرأتِ عرضِ حال کرتے ہو!

○

دے جامِ ارغواں! تری آنکھوں کی خیر ہو
اے دخترِ مغاں تری آنکھوں کی خیر ہو

ہر چیز میں ہے گردشِ ساغر کی کیفیت
ہر چیز ہے رواں، تری آنکھوں کی خیر ہو

مدّت کے بعد آج فقیروں کے جام میں
اُتری ہے کہکشاں، تری آنکھوں کی خیر ہو

ہستی کی گرد ہو تو خدا ہم کو پھونک دے
مستی ہے درمیاں، تری آنکھوں کی خیر ہو

اک زحمتِ نگاہ کا ہے منتظر عدمؔ
اے جانِ عاشقاں، تری آنکھوں کی خیر ہو

سنبھل سنبھل کے ہمیں پائمال فرماؤ
خدا کے واسطے کچھ تو خیال فرماؤ

میں کائنات کی گردش کا رُخ بدل دوں گا
سوال کیا ہے، مری جاں سوال فرماؤ

ہمیں حفاظتِ دل کی پڑی ہے زحمت کیا
تمھاری چیز ہے تم دیکھ بھال فرماؤ

یہ کون لوگ ہیں جن سے ہر ایک غنچہ و گل
یہ کہہ رہا ہے، ہمیں پائمال فرماؤ

مری خموش نگاہو! کبھی تو تم خود بھی!
نگاہِ یار سے کچھ عرضِ حال فرماؤ

کہاں گئی ہے عدمؔ عقل ہوشمندوں کی
ہم اور بادہ گساری! خیال فرماؤ

○

رُخ سے نقاب اُٹھا کہ درِ عرش باز ہو
سورج طلوع ہو تو ہماری نماز ہو

دلچسپ ہو گئی ہے پریشانیٔ حیات
اے زلفِ عنبریں تری الجھن دراز ہو

اے داستاں سرا کوئی غمگیں سی داستاں
اے مطربِ حسیں کوئی ٹوٹا سا ساز ہو

اہلِ نظر فریبِ حقیقت پہ ہنس پڑیں،
اتنا تو استوار فریبِ مجاز ہو

کرتے عدمؔ کچھ اور ہو کہتے ہو اور کچھ
ثابت ہوا کہ تم بھی بڑے پاکباز ہو!

○

بزمِ طرب میں سایۂ غم کو بھی لے چلو
جاتے ہو میکدے کو تو ہم کو بھی لے چلو

بیٹھا ہوں مثلِ نقشِ قدم راہِ زیست میں
لے جا سکو تو نقشِ قدم کو بھی لے چلو

جاتے ہو میکدے کو تو ایمان و کفر کیا
ڈر ہے تو ساتھ دیر و حرم کو بھی لے چلو

ہے میکدے کو ناز اگر اپنے ظرف پر
اک دن وہاں پیالۂ جم کو بھی لے چلو

کہتے ہیں اُس گلی کی ہوا میں ہے زندگی
یوں ہو تو ساتھ اپنے عدم کو بھی لے چلو

○

میخانۂ ہستی میں اکثر ہم اپنا ٹھکانہ بھول گئے
یا ہوش سے جانا بھول گئے یا ہوش میں آنا بھول گئے

اسباب تو بن ہی جاتے ہیں تقدیر کی ضد کو کیا کہئے
اک جام تو پہنچا تھا ہم تک ہم جام اُٹھانا بھول گئے

آئے تھے بکھیرے زلفوں کو اک روز ہمارے مرقد پر
دو اشک تو ٹپکے آنکھوں سے دو پھول چڑھانا بھول گئے

تصویر بنانے والوں نے جب اُس کی نگاہوں کو دیکھا
تصویر مرتّب کیا کرتے، تصویر بنانا بھول گئے

چاہا تھا کہ اُنکی آنکھوں سے کچھ رنگِ بہاراں لیجے
تقریب تو اچھی تھی لیکن، وہ آنکھ ملانا بھول گئے

معلوم نہیں آئینے میں چپکے سے ہنسا تھا کون عدمؔ
ہم جام اُٹھانا بھول گئے، وہ ساز بجانا بھول گئے

○

ناراض نہ ہو گر دو لمحے ہم تیرے دوارے آ بیٹھے
کچھ دل کے ستائے آ بیٹھے، کچھ درد کے مارے آ بیٹھے

جس باغ میں رونق ہوتی ہے انسان ٹھہر ہی جاتے ہیں
شہرت ترے کوچے کی سُن کر، ہم لوگ بھی پیارے! آ بیٹھے

آغازِ جوانی کا موسم اور ایک غزالِ رعنا پر
زلفوں سے بہاریں آ لپٹیں، ہونٹوں پہ ستارے آ بیٹھے

کلیوں کے جگر افسردہ ہیں، کانٹوں کی زبانیں سوکھی ہیں
ہم باغ کے دھوکے میں شاید جنگل کے کنارے آ بیٹھے

آلامِ زمانہ کے جُھرمٹ میں ہم ہیں عدمؔ یوں جام بکف
جیسے کہ وہ اپنی محفل میں زلفوں کو سنوارے آ بیٹھے

○

غم نہیں گر سحر نہیں آتی
موت بھی چارہ گر نہیں آتی؟

زندگی کے طویل رستے میں
کوئی منزل نظر نہیں آتی

میکدہ ہے یہاں سکون سے بیٹھ
کوئی آفت اِدھر نہیں آتی

دوستوں کی رضا پہ جیتے ہیں
دوستوں کی خبر نہیں آتی

کوئی صدمہ تو دل کو پہنچا ہے
بے سبب آنکھ بھر نہیں آتی

کچھ تمہارا پتہ نہیں چلتا
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

رات مر تو نہیں گئی شاید
صبح ہوتی نظر نہیں آتی

موت آتی تو ہے مگر اکثر
وقت سے پیشتر نہیں آتی،

چاندنی رات کا مزاج نہ پوچھ
ہم غریبوں کے گھر نہیں آتی

نیند بھی موت بن گئی ہے عدمؔ!
بے وفا رات بھر نہیں آتی،

○

غمِ ہستی کی رات جاتی ہے
تیری زلفوں کی بات جاتی ہے

تیرا دامن چلا ہے ہاتھوں سے
یا مری کائنات جاتی ہے

بندہ پرور، ذرا سی ہمدردی
بندہ پرور! حیات جاتی ہے

کس خرابات کی ہوا کھانے
صبح آتی ہے رات جاتی ہے

اس طرح کب یہ زخم بھرتا ہے،
جان لے کر حیات جاتی ہے

ہم اگر ہوش میں عدمؔ آئیں،
چشمِ ساقی کی بات جاتی ہے

○

زندگی یونہی راس ہو جائے
خوش نہیں تو اُداس ہو جائے

اُس کا مرنا محال ہے جس کو
تیرے ملنے کی آس ہو جائے

پھول وہ دل فریب کانٹا ہے،
رنگ جس کا لباس ہو جائے

وہ حقیقت شناس کیا ہو گا
جو حقیقت شناس ہو جائے

موسمِ گُل کو مشورہ دے دو
مسکرا کر اُداس ہو جائے

موت ہی اُن کو دے سکون عدمؔ
زندگی جن کی پیاس ہو جائے

○

دل ہے غائب کئی مہینوں سے
بات کیا کیجیے حسینوں سے

موسمِ گُل میں پھول گرتے ہیں
بادہ خواروں کی آستینوں سے

میکدے کا ضمیر روشن ہے
تیری آنکھوں کے آبگینوں سے

ہوش خود اک سیاہ مستی ہے
کیا کہیں میکدہ نشینوں سے

اے عدمؔ جن کی بات چلتی ہو
بات کرتے ہیں کن قرینوں سے

○

وقفِ الزام ہوں خدا نہ کرے
آپ بدنام ہوں خدا نہ کرے

جن خطاؤں کے لوگ ہیں ضامن
آپ کے نام ہوں خدا نہ کرے

ہم تو خیر ایک جنسِ ارزاں تھے
آپ بھی عام ہوں خدا نہ کرے

زندگی کے نیاز مندوں کو
موت سے کام ہوں خدا نہ کرے

جن کو اُن سے قدم قدم تعلق ہے
میرے ہم نام ہوں خدا نہ کرے

○

زندگی صرفِ آہ آہ نہ کی!
قیمتی چیز تھی، تباہ نہ کی

آپ بے شک درست کہتے ہیں
ہم نے ہی آپ سے نباہ نہ کی

عقل ترغیب دے رہی تھی مگر
عشق نے جرأتِ گناہ نہ کی

بھول کیا اُس کی آبرو کرتے
جس نے کانٹوں سے رسم و راہ نہ کی

موت تو اتنی سرد مہر نہ تھی
زندگی نے ہی کچھ نباہ نہ کی

اے عدمؔ اُس کو کون بخشے گا
جس نے فردِ عمل سیاہ نہ کی

○

آرزوؤں کے خواب کیا دیں گے
خوبصورت سراب کیا دیں گے

کچھ کیا ہی نہیں جوانی میں
حشر کے دن حساب کیا دیں گے

جن پیالوں میں موجِ رنگ نہیں
وہ صدائے رباب کیا دیں گے

روشنی مانگ چشمِ ساقی سے
ڈوبتے آفتاب کیا دیں گے

جینے والے تو خیر بے بس ہیں
مرنے والے جواب کیا دیں گے

آپ ہی اے عدمؔ جو پیاسے ہوں
تجھ کو خانہ خراب کیا دیں گے

○

اُس کی آنکھوں کو مست دیکھا ہے
نورِ صبحِ الست دیکھا ہے

جس کو دیکھا ہے بزمِ ہستی میں
مفلس و تنگ دست دیکھا ہے

بُلبلے کی حسیں عمارت میں!
اک جہانِ شکست دیکھا ہے

عالمِ ہست و بود کیا دیکھیں
عالمِ بود و ہست دیکھا ہے

ہم نے جب بھی عدمؔ کو دیکھا ہے
اپنی حالت میں مست دیکھا ہے

اہتمامِ حیات کیا کرتے
یہ تکلف کی بات کیا کرتے

تنگ تھے دل نگاہ والوں کے
خواہشِ التفات کیا کرتے

گیسوؤں کو سنوارنے والے
بدنصیبوں سے بات کیا کرتے

زندگی نام تھا ندامت کا
حادثے کو حیات کیا کرتے

بات کرنے گئے تھے اُن سے مگر
بات کرتے تو بات کیا کرتے

داستاں میں ہی کوئی ربط نہ تھا
اے عدمؔ واقعات کیا کرتے

○

زندگی کا شباب دیکھا ہے — اک پریشاں سا خواب دیکھا ہے
ایک تصویر، وہ بھی روٹھی سی، — عقل کا انتخاب دیکھا ہے
دستِ ساقی میں آج ہم نے بھی — صبح کا آفتاب دیکھا ہے
جس کو کہتے ہیں دوستوں کا سلوک — وہ ستم بے حساب دیکھا ہے
کس قدر ہوشمند ہے دنیا! — دلِ خانہ خراب دیکھا ہے
اپنی صورت کو دیکھنے والے — وقت کا انقلاب دیکھا ہے
زندگی اس طرح گزاری ہے — جس طرح کوئی خواب دیکھا ہے

آنکھ دیکھی ہے اُس حسیں کی عدمؔ
یا ضمیرِ شراب دیکھا ہے

○

اُن کو خوئے دفا نہ ہو جائے
ظلم کی انتہا نہ ہو جائے

عزمِ توبہ تو کر رہا ہوں میں
تیری رحمت خفا نہ ہو جائے

ہم کو بھی دے رہے ہو ساغرِ مے
خونِ ارض و سما نہ ہو جائے

اومری سمت دیکھنے والے
تو مرا مدّعا نہ ہو جائے

ڈوبنے سے تو احتراز نہیں
شہرتِ ناخدا نہ ہو جائے

زندگی کو گزارنے والے!
زندگی بد دعا نہ ہو جائے

آدمیّت عدمؔ گناہ نہیں
اُس سے کہہ دو خدا نہ ہو جائے

○

گیسوؤں کو دراز رہنے دے!
ہم کو محوِ نماز رہنے دے

تیری آنکھوں میں رنگ باقی ہے
میرے ہاتھوں میں ساز رہنے دے

آئینے میں نہ ڈھال صورت کو
کچھ نہ کچھ امتیاز رہنے دے

اپنی آنکھوں کو میکدہ نہ بنا
میری ہستی کو راز رہنے دے

اے مغنّی! ترے مذاق کی خیر
ٹوٹ جائے گا ساز رہنے دے

دے عدم کو نہ آگہی کا فریب
آبروئے مجاز رہنے دے

○

کہہ رہے تھے جو تیرے افسانے
وہ کہاں کھو گئے، خدا جانے

ناخدا خود بھی کچھ سمجھ نہ سکا،
ناؤ سے کیا کہا تھا دریا نے

اِس تبسّم فروش دنیا میں
ہم غریبوں کو کون پہچانے

ہے یہی شکل اگر حقیقت کی
تو بڑے قیمتی ہیں افسانے

شمع کو کون اب عدم پوچھے
جل چکے ہیں تمام پروانے

○

بھول کر ایک بار تھم جاتی
گردشِ روزگار تھم جاتی

آپ اگر آئینہ طلب کرتے
دو گھڑی جوئبار تھم جاتی

ہم نے دو چار جام پینے تھے
اے ہوائے بہار تھم جاتی

یا سحر کا ثبوت مل جاتا
یا شبِ انتظار تھم جاتی

تم نے تکلیف ہی نہ کی ورنہ
گردشِ روزگار تھم جاتی

چارہ گر کی عدم اگر سنتے
نبض بے اختیار تھم جاتی

○

جب بھی وہ شکل راہ میں پائی
روشنی سی نگاہ میں پائی

حُسن نے اپنے کھوٹ کی قیمت
عشق کی بارگاہ میں پائی

دل کی تسکین جب کہیں نہ ملی
اُن کی زلفِ سیاہ میں پائی

ہم نشیں دیکھ میکدے کا چراغ
ہائے! کیا چیز راہ میں پائی

اپنی تصویر زندگی نے عدم
میرے حالِ تباہ میں پائی

○

کوئی تدبیر رنگ لا نہ سکی
صبح گزری تو شام آ نہ سکی

ہم کو کیا دعوتِ طرب دیتی
زندگی خود بھی مسکرا نہ سکی

اُن سے کرنی تھیں سینکڑوں باتیں
پر کوئی بات یاد آ نہ سکی

جس کلی کو خزاں کا کھٹکا تھا
پھول بن کر بھی مسکرا نہ سکی

جی اُٹھا جب کسی نے پیار کیا
دلِ ناداں کو موت آ نہ سکی

سو گئے جب مسافرانِ عدم
صبحِ محشر بھی پھر جگا نہ سکی

○

دعوتِ جشن ہے ہوا کے لئے
بوجھ کافی ہے ناخدا کے لئے

اور تو کچھ نہیں ہمیں معلوم
جی رہے ہیں تری رضا کے لئے

دل کی تالیف اگر نہیں ہوتی
توڑ ہی دیجیے خدا کے لئے

بھیک مذہب سہی فقیروں کا
ہاتھ اُٹھتے نہیں دعا کے لئے

خلد میں بھی عدمؔ اُداس ہے دل
کوچۂ یار کی ہوا کے لئے

○

زندگی کا جواز غائب ہے
جام غائب ہے، ساز غائب ہے

غم کی راہِ طویل ہے درپیش
تیری زلفِ دراز غائب ہے

یا مرض لاعلاج ہے میرا
یا مرا چارہ ساز غائب ہے

دیکھ کر منہ خدا پرستوں کے
مسجدوں سے نماز غائب ہے

اب فقط غیب پر نظر ہے عدم
اب مرا کارساز غائب ہے

○

رات کس شغل میں گزاری ہے
آپ کی آنکھ بھاری بھاری ہے

گردشِ جام کی ضرورت کیا!
گردشِ روزگار جاری ہے

آج ہم نے بھی جبر سے ہنس کر
جینے والوں کی نقل اُتاری ہے

ایک ہنستی ہوئی پریشانی
ہائے کیا زندگی ہماری ہے

کھِل رہے ہیں ہزار رنگ کے پھول
کون مصروفِ لالہ کاری ہے

مسکرا دو ہماری حالت پر
یہ بھی اک طرزِ غمگساری ہے

اے فقیرانِ کوچۂ جاناں!
یہ فقیری تو شہریاری ہے

پسِ پردہ بھی کچھ نہیں موجود
پردہ داری ہی پردہ داری ہے

دوستی اُن سے ہو گئی ہے عدمؔ
جن کی ہر بات کاروباری ہے

○

درد کی واردات ہے پیارے
داستانِ حیات ہے پیارے

تیری آنکھوں کا بھی بھروسہ کیا
عالمِ حادثات ہے پیارے

کون اِس سلسلے کو ختم کرے
تیری زلفوں کی بات ہے پیارے

مستقل موت کی تمنّا ہے
آرزوئے حیات ہے پیارے

صبحِ محشر تو آ ہی جائے گی!
رات کٹنے کی بات ہے پیارے

بات سن لے ترا بھلا ہو گا
دردمندوں کی بات ہے پیارے

ہم عدمؔ اور بادہ پیمائی
کہنے سننے کی بات ہے پیارے

○

دل نہیں ایک داغ ہے پیارے
مفلسوں کا چراغ ہے پیارے

لوگ کہتے ہیں تیرا وعدہ بھی
صرف اک سبز باغ ہے پیارے

کون پہنچے تری مشیت کو،
اپنا اپنا دماغ ہے پیارے

اک نہ اک روز بجھ ہی جائے گا
زندگی کا چراغ ہے پیارے

آج ہر درد مٹ چکا ہے عدمؔ
آج دل باغ باغ ہے پیارے

○

اس طرح عہدِ بہار آ کے گزر جاتا ہے
جس طرح رنگ کھلونوں کا اُتر جاتا ہے

کیوں پریشاں ہیں نہ معلوم نہ جینے والے!
جس کو جینے کی نہ توفیق ہو مر جاتا ہے

میں نے سمجھا تھا چھلکتے ہی رہیں گے ساغر
مجھ کو معلوم نہ تھا وقت گزر جاتا ہے

پھول دو چار جو بچنے ہیں چمن سے چُن لے
رنگ کی بات نہ کر، رنگ بکھر جاتا ہے

یوں تو ملتا ہی نہیں گھر سے کسی وقت عدمؔ
شام کے وقت نہ معلوم کدھر جاتا ہے

○

مہ جبینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے
نازنینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے

یا ستاروں سے بڑا اُنس رہا ہے ہم کو
یا حسینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے

تیری شفّاف نگاہوں کے تبسّم کی قسم
آبگینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے

مست آنکھوں پہ بہت جان نچھاور کی ہے
تنگ سینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے

کتنی دلکش ہیں عدمؔ ماہ وشوں کی گلیاں!
ان زمینوں سے بڑا پیار کیا ہے ہم نے

○

تیری آنکھوں پہ اشاروں کا گماں ہوتا ہے
نو تراشیدہ ستاروں کا گماں ہوتا ہے

تم کو شاداب ہواؤں کی مہک آتی ہے
مجھ کو نوخیز بہاروں کا گماں ہوتا ہے

دور افتادہ کناروں کی مہک پر ساقی
مجھ کو بچھڑے ہوئے یاروں کا گماں ہوتا ہے

بعض اوقات تصوّر کے حسیں لمحوں میں
دل کی آہٹ پہ نگاروں کا گماں ہوتا ہے

آنکھ اُٹھتی ہے جدھر عہدِ جوانی میں عدم
مہ جبینوں کی قطاروں کا گماں ہوتا ہے

○

رند اور ترکِ خرابات بڑی مشکل ہے
شیخ صاحب یہ کرامات، بڑی مشکل ہے

آپ اگر بات پہ کچھ غور کریں بندہ نواز
بات آسان نہیں، بات بڑی مشکل ہے

لائیے کوزۂ صہبا کہ کدورت دھو لیں
بے وضو ہم سے مناجات بڑی مشکل ہے

دوسروں سے بہت آسان ہے ملنا ساقی
اپنی ہستی سے ملاقات بڑی مشکل ہے

گو ہر اک رات ہے تکلیف سے لبریز عدم
لوگ کہتے ہیں کہ اک رات بڑی مشکل ہے

اے دوست کمال ہو گیا ہے
سامانِ وصال ہو گیا ہے

ہونٹوں کو تو سی لیا تھا ہم نے
آنکھوں سے سوال ہو گیا ہے

جینا تو محال تھا ہی لیکن!
مرنا بھی محال ہو گیا ہے

دلِ موسمِ گل کی بات سن کر
کانٹے کی مثال ہو گیا ہے

کیا پوچھتے ہو مزاج دل کا
ویسے ہی نڈھال ہو گیا ہے

تکلیف عدم کی بڑھ گئی ہے
ہستی کا خیال ہو گیا ہے

○

جو چیز سازگار تھی ناساز ہو گئی
نغمے کی لے درد کی آواز ہو گئی

تھا زندگی کے رنگ کا اُڑنا بھی ایک جشن
موت اس ادا سے آئی کہ پرواز ہو گئی

صرف اک تری نگاہ تھی سرمایۂ حیات
وہ بھی شکستِ ساز کی آواز ہو گئی

جو کام بن گیا وہ مشیت کی بھول سے
جو بات ہو گئی وہ خدا ساز ہو گئی

اُن کی نگاہ کا تو یہ مقصد نہ تھا عدم
ویسے ہی داستان سی آغاز ہو گئی

○

بربط ذرا سنبھال! بہار آ ہی جائے گی
ساغر میں رنگ ڈال بہار آ ہی جائے گی

بکھرا فضا کے دوش پہ جب جھومتا ہوا
کالی لٹوں کا جال، بہار آ ہی جائے گی

ہلکے سے اک لطیف تبسم کی دیر ہے
اے صاحبِ جمال بہار آ ہی جائے گی

اے مہ جبیں بہار کا اتنا بھی کیا خیال
اتنا بھی کیا خیال بہار آ ہی جائے گی

جاتی ہے دُور دُور صراحی کی لَے عدم
ساغر ذرا اُچھال بہار آ ہی جائے گی

○

یہ مدّعا نہیں کہ وہ ہم کو شراب دے
اتنا تو ہو کہ کوئی مناسب جواب دے

میں بھی تری طرح کوئی رستہ تو ڈھونڈ لوں
مجھ کو بھی مشورہ دلِ خانہ خراب دے

بر لب سے مے رواں ہو، صراحی سے راگنی
ساقی رباب چھیڑ، مغنّی شراب دے

شبنم تو آفتاب کے پینے کی چیز ہے
ہم میکشوں کو خونِ رگِ آفتاب دے

جس نے عدمؔ کلیم کو بے ہوش کر دیا
اُس سے کہو کہ ہم کو بھی کوئی جواب دے

○

جو لوگ جان بوجھ کے نادان بن گئے
میرا خیال ہے کہ وہ انسان بن گئے

ہم حشر میں گئے تھے مگر کچھ نہ پوچھیے
وہ جان بوجھ کر وہاں انجان بن گئے

ہنستے ہیں ہم کو دیکھ کے اربابِ آگہی
ہم آپ کے مزاج کی پہچان بن گئے

منجدھار تک پہنچنا تو ہمت کی بات تھی
ساحل کے آس پاس ہی طوفان بن گئے

انسانیت کی بات تو اتنی ہے شیخ جی!
بدقسمتی سے آپ بھی انسان بن گئے

کانٹے تھے چند دامنِ فطرت میں اے عدمؔ
کچھ پھول اور کچھ مرے ارمان بن گئے

○

یہ بات ہو سکے تو گوارا کرے کوئی
گرنے لگوں تو اُن کو اشارا کرے کوئی

قسمت کی الجھنوں کا فقط اک علاج ہے
اُس زلفِ عنبریں کو سنوارا کرے کوئی

جیتا ہے کون جان نہ جب تک ہو جسم میں
تیرے بغیر کیسے گزارا کرے کوئی

سجدے کو آفتاب نہ اُترے تو حیف ہے
صرف اتنی شرط ہے کہ اشارا کرے کوئی

تکلیف کا علاج تو مشکل نہیں عدم
تکلیف اگر ذرا سی گوارا کرے کوئی

○

غم کا سرور ہے کہ خوشی کا ظہور ہے
چہرے پہ اک اُداس سی رونق ضرور ہے

اے دوست آئینہ نہیں تنہا قصوروار
ڈھلتے ہوئے شباب کا بھی کچھ قصور ہے

کتنی حسیں ہیں زہرہ جبینوں کی بستیاں
گلیوں میں چاندنی ہے دریچوں میں نور ہے

اے ناخدا میں کوئی فسانہ نہ چھیڑ دوں!
ساحل کی روشنی تو افق سے بھی دور ہے

گو ہم بھی ہیں فقیرِ خرابات اے عدمؔ
لیکن یہ فرق ہے کہ طبیعت غیور ہے

○

جو چاند، جو ہلال ہے رُوٹھا ہُوا سا ہے
اک نقش کی مثال ہے، روٹھا ہُوا سا ہے

جس صاحبِ جمال کو دیکھو ہے ایک چیز
جو صاحبِ جمال ہے، روٹھا ہُوا سا ہے

جس آنکھ میں خلوص ہے ڈوبی ہوئی سی ہے
جس آئینے میں بال ہے رُوٹھا ہُوا سا ہے

بت خانۂ خیال ہے یا شہرِ سوئے ظن
جو پیکرِ خیال ہے رُوٹھا ہُوا سا ہے

اُس مہ جبیں کو کس طرح پہلو میں لیں عدمؔ
ماہِ شبِ وصال ہے رُوٹھا ہُوا سا ہے

○

وہ آ گئے تو قلب کی تالیف ہو گئی
رخصت ہوئے تو پھر وہی تکلیف ہو گئی

محشر میں اک سوال کیا تھا کریم نے
مجھ سے وہاں بھی آپ کی تعریف ہو گئی

اسبابِ بدمزاجیٔ زاہد نہ پوچھیے!
میں پی رہا تھا، آپ کو تکلیف ہو گئی

دامن چھڑا کے یوں کوئی رخصت ہوا عدمؔ
سرمایۂ حیات میں تخفیف ہو گئی

○

جو دن کسی کے ساتھ گزارے، نہ مل سکے
حالات گیسوؤں کو سنوارے نہ مل سکے

جن کشتیوں کو میرے مقدّر کی رَو ملی
اُن کشتیوں کو گھاٹ کنارے نہ مل سکے

تم کیا گئے کہ رونقِ ہستی چلی گئی
غنچے نہ مسکرائے، ستارے نہ مل سکے

دریا کو کچھ خبر ہے تو دریا سے پوچھئے
کیوں اس مقام پر بھی کنارے نہ مل سکے

دنیا بڑی حسین تھی لیکن بڑی غریب
ہر راستے میں چاند ستارے نہ مل سکے

ہر باغ کے طیور نہ تھے خوش نوا عدمؔ
ہر دیس میں حریف ہمارے نہ مل سکے

○

اُس چشمِ مست سے ہے عقیدت کہیں جسے
احساسِ بے خودی کی ضرورت کہیں جسے

آ تو نہیں گئی کسی زہرہ جمال پر
کیا اُس کا نام ہے کہ طبیعت کہیں جسے

چھوٹی سی ایک بات ہے اے جانِ آرزو
وہ سلسلہ نہیں ہے حکایت کہیں جسے

لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے اے قلبِ نامراد
تسکینِ اضطراب کی صورت کہیں جسے

اے دوست میرے سینے کی دھڑکن کو دیکھنا
وہ چیز تو نہیں ہے محبّت کہیں جسے ؟

اے جانِ عشق! تیرے تغافل کی خیر ہو
اک اور چیز بھی ہے مروّت کہیں جسے

مطرب بس ایک زخم کی حسرت ہے روح کو
نغمہ کہیں کہ ہوشِ سماعت کہیں جسے

سمٹی تو تنگیٔ دہنِ یار بن گئی
وہ چیز کائنات کی وسعت کہیں جسے

دینے لگے ہیں پھر وہ فریبِ نظر عدمؔ
پھر پڑ گئی ہے دل کی ضرورت کہیں جسے

○

او مستِ ناز جشن منانے کی رات ہے
جام و سبو سے رنگ بہانے کی رات ہے

کرتا ہوں اُس حسیں کی عبادت کہ ہمنشیں
پلکوں پہ چاندنی کو بٹھانے کی رات ہے

انگڑائیوں کو گیت کے سانچے میں ڈھال دو
کہتے ہیں لوگ ساز بجانے کی رات ہے

زلفوں کو خوشگوار ہوا میں بکھیر دو!
شبرنگ کاکلوں کو اُڑانے کی رات ہے

یہ دیکھ لو کہ وقت کا ہے کیا مطالبہ
یہ سوچ لو کہ ہوش سے جانے کی رات ہے

پھولوں کی ٹہنیوں میں ستاروں کو ٹانک دو
صحنِ چمن میں جوت جگانے کی رات ہے

بربط میں بھی کنول ہیں، صراحی میں بھی کنول
ثابت ہوا کہ پھول کھلانے کی رات ہے

اب بھی جو تشنہ کام رہے اُس کا کیا علاج
کہہ تو دیا ہے مَے میں نہانے کی رات ہے

رنگین ساغروں کے تکلّف کو چھوڑ کر
مخمور انکھڑیوں سے پلانے کی رات ہے

بندہ نواز رُخ سے اُلٹ دیجئے نقاب
کون و مکاں پہ برق گرانے کی رات ہے

یہ رات تو فراق کے صدموں کو اے عدمؔ
آغوشِ مرمریں میں سُلانے کی رات ہے

○

رنگ تصویروں میں بھرنا چاہیے
اے مصوّر کچھ تو کرنا چاہیے

ہمنشیں کافی سفر طے کر لیا
شام ہے اب تو ٹھہرنا چاہیے

بیٹھ کر سرسبز پیڑوں کے قریب
اپنا اپنا جام بھرنا چاہیے

گرد سے لبریز ہے آنکھوں کی جوت
آئینوں کو صاف کرنا چاہیے

دل سے اُٹھنی چاہیے پتھّر کی سِل
بوجھ رستے کا اُترنا چاہیے

چوم کر اک دوسرے کو پیار سے
کہکشاں پر پاؤں دھرنا چاہیئے

گونج اُٹھنا چاہیئے مانندِ ساز
اور فضاؤں میں بکھرنا چاہیئے

بھر گئی ہے رات تاروں سے عدمؔ
اب تو اُٹھ کر رقص کرنا چاہیئے

○

زیست مرگِ ناگہانی بن گئی
ضبط کی کوشش کہانی بن گئی

راحت و غم کا گلا کیا کیجیے
زندگی تھی آگ پانی بن گئی

فصلِ گل میں جو کلی مرجھا گئی
وہ بہارِ جاودانی بن گئی

ہم نے مانگا تھا حقیقت کا ثبوت
زندگی ہنس کر کہانی بن گئی

جو حسیں صورت نظر آئی عدمؔ
دعوتِ مرگِ جوانی بن گئی

○

مسکرا کر بات کرتے جائیے
ردِ تکلیفات کرتے جائیے

دیر سے بیٹھا ہے رستے میں فقیر
کچھ نہ کچھ خیرات کرتے جائیے

غمگساری کے کئی اسلوب ہیں
خوگرِ آفات کرتے جائیے

یہ گریباں ہے، یہ دامن ہے، یہ ہاتھ
آپ احکامات کرتے جائیے

حضرتِ غم اور کیا خدمت کروں
میکشی دن رات کرتے جائیے

مل ہی جائے گا عدمؔ کوئی صلا
بے غرض خدمات کرتے جائیے

○

رفتہ رفتہ کام بنتے جائیں گے
زخم خود ہی جام بنتے جائیں گے

سلسلہ جاری رہے گا بات کا
خواہشوں کے دام بنتے جائیں گے

عالمِ اسباب ہے یہ ہمنشیں
بے تکلّف کام بنتے جائیں گے

اپنی صورت کو چھپا لو آج ہی
آئینے اوہام بنتے جائیں گے

آنکھ میں جب تک ذرا سا رنگ ہے
راستے گلفام بنتے جائیں گے

ساغروں کے دور بھی آخر عدم
گردشِ ایام بنتے جائیں گے

○

نبضِ ساکت کو روانی چاہیے
باغباں پھولوں کو پانی چاہیے

ایک دو رنگین کانٹے بخش دو
موسمِ گل کی نشانی چاہیے

ہم کو کیوں دیتے ہو زہرِ زندگی
ہم کو مرگِ ناگہانی چاہیے

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں
دوستوں کی مہربانی چاہیے

ایک صدمے کی تواضع کے لئے
ایک جامِ ارغوانی چاہیے

اے عدمؔ کیسے کٹے گی زندگی
کوئی عذرِ زندگانی چاہیے

اُنھیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے
مچلنے کا بہانہ ہو گیا ہے

حسینوں کے فسانے سنتے سنتے
تصوّر عاشقانہ ہو گیا ہے

خدا کی یاد کام آ ہی گئی ہے
بتوں سے دوستانہ ہو گیا ہے

نہ دو آوازِ دردِ زندگی کو!
مسافر تھا، روانہ ہو گیا ہے

وہ دل تم نے جسے ٹھکرا دیا تھا
حوادث کا نشانہ ہو گیا ہے

عدمؔ شاید کسی زہرہ جبیں سے
تعلق غائبانہ ہو گیا ہے

ہوا بھی کچھ حشر میں مری جاں تو اور کیا واردات ہوگی
مری محبّت کا ذکر ہوگا، تری جوانی کی بات ہوگی

ہجومِ محشر میں لب ہلے بھی تو آپ اتنا یقین رکھیں
مبالغے سے نہ کام لیں گے گذارشِ واقعات ہوگی

غمِ زمانہ چل آ ذرا، میکدہ نشینوں کے پاس بیٹھیں
کوئی طریقے کی چیز ہوگی، کوئی سلیقے کی بات ہوگی

وہ چیز اے غمگسار جس نے ہر ایک انساں کو پھونک ڈالا
تجھے شکایت ہے موت تھی وہ، مجھے گماں ہے حیات ہوگی

میں اپنے جلتے ہوئے لبوں کو نہ تیرے ہونٹوں پہ ثبت کر دوں
تری نگاہوں سے کیا مری جاں، مری تسلّی کی بات ہوگی

ابھی عدم کیا یقین آئے کہ چاندنی رات ہو گئی ہے
وہ زلف بکھری تو دن ڈھلے گا، وہ چاند نکلا تو رات ہوگی

○

زیست اک کہانی ہے، موت اک فسانہ ہے
آپ کی مروّت کا زخم، غائبانہ ہے

دورِ جام و مینا کی تمکنت بجا لیکن
گردشِ زمانہ بھی گردشِ زمانہ ہے

عشق کی شریعت کے قاعدے نرالے ہیں
رقص اک عبادت ہے، رنگ اک ترانہ ہے

لوگ دردِ ہستی کا زہر پی نہیں سکتے
آپ کی محبّت تو صرف اک بہانہ ہے

اے عدمؔ جو سنتا ہے ہوش میں نہیں رہتا
بات چشمِ ساقی کی رمزِ عارفانہ ہے

○

ہر ایک آنکھ خرابِ تجلّیات نہ تھی
وگرنہ ہوش میں رہنے کی کوئی بات نہ تھی

طلوعِ حشر پہ ہی ختم ہو گئی آ کر
بہت دراز غمِ زندگی کی رات نہ تھی

بڑی طویل حکایت تھی داستانِ حیات
مگر تمام حکایت میں کوئی بات نہ تھی

کلی ہنسی تھی کہ سازِ بہار ٹوٹ گیا
فریبِ ہوش تھا قیدِ تعلّقات نہ تھی

غمِ حیات کی تلخی کا تذکرہ تھا عدمؔ
خدا نخواستہ کوئی نشے کی بات نہ تھی

○

شفق کا ذکر، ستاروں کی بات رہنے دے
نظر فریب اشاروں کی بات رہنے دے

نہ ذکر چھیڑ کسی کی دراز زلفوں کا
سیاہ مست خماروں کی بات رہنے دے

تری نگاہ سے قائم ہے رونقِ ہستی،
نظر نہ پھیر نظاروں کی بات رہنے دے

مرے ندیم یہ چیزیں ہیں ٹوٹنے والی
مرے ندیم سہاروں کی بات رہنے دے

میں کھا چکا ہوں بڑے زخم باغِ ہستی سے
میں سن چکا ہوں بہاروں کی بات رہنے دے

عدمؔ شباب کے ایّام یاد آتے ہیں
اُداس اُداس بہاروں کی بات رہنے دے

○

تری نگاہ اگر غم گسار ہو جائے
غمِ زمانہ نویدِ بہار ہو جائے

اُڑے تو رنگ بڑی بے رخی سے اُڑتا ہے
تری نظر نہ مرا اعتبار ہو جائے

اُفق کے پاس کوئی شے نظر تو آتی ہے
قریب آ کے نہ موجِ غبار ہو جائے

طلوعِ حشر کا بھی کیا یقین ہے پیارے
دراز ہو تو شبِ انتظار ہو جائے

اگر خبر ہو گریباں کو اپنی قیمت کی
تو مسکرا کے عدمؔ تار تار ہو جائے

وہ مسکرا کے ہمیں دل فگار چھوڑ گئے
قرار لے گئے اور بے قرار چھوڑ گئے

وہی تو دل تھا، وہی تو متاعِ ہستی تھی
جو تیری بزم میں ہم بار بار چھوڑ گئے

ہماری حسرتِ منزل کو لے گئے تو کیا
ہمیں تو لوگ سرِ رہگزار چھوڑ گئے

لباسِ گل میں بڑی تمکنت سے آئے تھے
مگر گئے تو وہی چند خار چھوڑ گئے

رہِ حرم نہ سہی، میکدے کی راہ سہی!
عدمؔ کہیں تو ہمیں غمگسار چھوڑ گئے

○

بڑے خلوص سے یہ کاروبار کرتے تھے
کسی کی مست نگاہوں سے پیار کرتے تھے

ہماری زیست کا عنواں ہی اُڑ گیا ہنس کر
وہ گفتگو کا کہاں اختصار کرتے تھے

ہماری سادہ مزاجی کا حادثہ مت پوچھ
تری نظر پہ بھی ہم اعتبار کرتے تھے

چمن کے پھول بڑی دیر تک رہے تازہ
گماں یہ ہے کہ ترا انتظار کرتے تھے

وہی تو دَورِ عدَم دورِ تھا حقیقت کا
ہر اک فریب پہ جب اعتبار کرتے تھے

○

مری بربادیوں کو تیری صورت تو نہیں کہتے
غمِ ہستی کو بیدادِ مشیّت تو نہیں کہتے

وہ وعدہ جو غریبوں کی تسلّی کا بہانہ ہے
اُسی وعدے کو یارب! باغِ جنّت تو نہیں کہتے

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ کسک محسوس ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبّت تو نہیں کہتے

سفینہ غرق ہے، ملّاح نذرِ موجِ دریا ہے
مرے مولا اسے طوفانِ رحمت تو نہیں کہتے

ریاضِ خلد سے نکلا تھا آدم جس کی برکت سے
عدمؔ اُس حادثے کو آدمیّت تو نہیں کہتے

○

ان کی مست آنکھوں سے کچھ ایسی عقیدت ہو گئی
جام مذہب بن گیا، صہبا شریعت ہو گئی

پہلے پیتے تھے کوئی معقول موقع ڈھونڈ کر
رفتہ رفتہ بے سبب پینے کی عادت ہو گئی

جس جگہ صدیوں کے سجدے بھی رہے ناکامیاب
اُس جگہ اک آہ تکمیلِ عبادت ہو گئی

اک ستارہ، اک کلی، اک مے کا قطرہ، ایک زلف
جب اکٹھے ہو گئے تعمیرِ جنّت ہو گئی

تم نہیں آتے نظر تو دل کو ہو جاتا ہے کچھ
اور اگر یہ خود فراموشی محبّت ہو گئی

جب کسی زلفِ پریشاں کی ہوا آئی عدمؔ
زیست کی آشفتگی سامانِ راحت ہو گئی

○

اب شدّتِ غم میں مصنوعی آرام سہارا دیتا ہے
یا دوست تسلّی دیتے ہیں، یا جام سہارا دیتا ہے

اے دوست محبّت کے صدمے تنہا ہی اٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتا ہے

بیتابیٔ دل کی کیفیت اس حال تک اب آپہنچی ہے
جس حال میں ہر مایوسی کو انجام سہارا دیتا ہے

اک تہمتِ رنگیں کی خاطر، ہر آنکھ کو سجدہ کرتے ہیں
اربابِ نظر کو مستی کا الزام سہارا دیتا ہے

دو نام ہیں صرف اس دنیا میں اک ساقی کا اک یزداں کا
اک نام پریشاں کرتا ہے، اک نام سہارا دیتا ہے

طوفان کے چیتون تو دیکھو، ساحل کی کوئی امید بھی ہے
ملّاح کی صورت تو دیکھو، ناکام سہارا دیتا ہے

ہم کو بھی عدم کچھ قائل کر کیا لطف ہے اس بدمستی میں
کیا آگ سکوں پہنچاتی ہے، کیا جام سہارا دیتا ہے

○

وہ زلف یوں بکھر کے دل آرام ہو گئی
دن گرمیوں کا ڈھل گیا اور شام ہو گئی

وہ جنبشیں تھیں ایک فسوں ساز آنکھ کی
اک کائنات بن گئی اک جام ہو گئی

اے قلبِ نامراد توقف بھی کر کہیں
ہر قافلہ ٹھہرنے لگا شام ہو گئی

ساقی وہ تیز مے جسے کہتے ہیں زندگی
میرے لئے تو گردشِ ایام ہو گئی

یزداں کی وہ ادا جو معمہ نہ بن سکی
بے ساختہ تجلّیٔ اصنام ہو گئی

بے احتیاطیوں کے تدبّر سے اے عدمؔ
ہر تلخیٔ حیات دل آرام ہو گئی

○

آج پھر روح میں اک برق سی لہراتی ہے
دل کی گہرائی سے رونے کی صدا آتی ہے

یوں چٹکتی ہیں خرابات میں کلیاں جیسے
تشنگی ساغرِ لبریز سے ٹکراتی ہے

شعلۂ غم کی لپک اور مرا نازک سا مزاج
مجھ کو فطرت کے رویّے پہ ہنسی آتی ہے

موت اک امرِ مسلّم ہے تو پھر اے ساقی
روح کیوں زیست کے آلام سے گھبراتی ہے

سو بھی جا اے دلِ مجروح بہت رات گئی
اب تو رہ رہ کے ستاروں کو بھی نیند آتی ہے

اور تو دل کو نہیں ہے کوئی تکلیف عدمؔ
ہاں ذرا نبض کسی وقت ٹھہر جاتی ہے

اے دخترِ بہار، بہاروں کے ساتھ پی
لہروں کے ساتھ ناچ، ستاروں کے ساتھ پی

اربابِ خانقاہ نہیں تیرے ہم مذاق
اے مردِ نیک بادہ گساروں کے ساتھ پی

لہرا کے جام اٹھا کبھی لہرا کے جام رکھ
تھم تھم کے سانس لے کے سہاروں کے ساتھ پی

صحنِ چمن میں حسنِ عقیدت سے بیٹھ کر
رحمت کی مست مست پھواروں کے ساتھ پی

صبحِ ازل کی یاد اگر مضطرب کرے
ساقی کی انکھڑیوں کے اشاروں کے ساتھ پی

محدود کر نہ مشربِ رندی کو اے عدمؔ
غیروں کے ساتھ پی کبھی یاروں کے ساتھ پی

○

شہرت پکڑ رہا ہے مرے غم کا راز بھی
دنیا ہے بے شعور بھی افسانہ ساز بھی

اک رات سے زیادہ نہ مجھ پر بکھر سکی
حد درجہ مختصر تھی وہ زلفِ دراز بھی

ہے میرا کفر تمکنتِ بندگی کی آگ
میرے ہی گھر کی راکھ ہے تیری نماز بھی

لا بھی شرابِ ڈس بھی گئی تلخیِ حواس
اِس زندگی کا اصل بھی دھوکا مجاز بھی

دل ہو ذرا کشادہ تو تُو خود بھی دیکھ لے
آتی ہے بتکدے سے نسیمِ حجاز بھی

دیکھیں جنونِ شوق کا کیا حشر ہو عدم
دلِ غم پرست بھی ہے حوادث نواز بھی

مے میں ڈوبے ہوئے جذبات کی بُو آتی ہے
میرے شعروں سے خرابات کی بُو آتی ہے
رہبروں کو مرے رستے سے ہٹا دو یک لخت
اِن سے فرسودہ روایات کی بُو آتی ہے
ابر اُفق سے ابھی اُٹھا بھی نہیں اے ساقی
یہ کہاں سے مجھے برسات کی بُو آتی ہے
تیری رفتار ہے یا صبحِ ازل کی مستی!
تیری رفتار سے نغمات کی بُو آتی ہے
تیری مہکی ہوئی زلفوں کے سہانے پن سے
ایک افسانہ سرارات کی بُو آتی ہے
ساقیا مجھ کو تری ہنستی ہوئی آنکھوں سے
ایک دیرینہ ملاقات کی بُو آتی ہے
یہ نہیں علم محبت کسے کہتے ہیں عدمؔ
ہاں مگر دل سے کسی بات کی بُو آتی ہے

○

زیست کو رنگ نہ کھا جائے تو اک موتی ہے
غم کے احساس میں بھی ایک خوشی ہوتی ہے

دیکھئے جان نکلتی ہے کہ ارماں دل کا
زندگی حلق میں اٹکا ہوا اک موتی ہے

یوں اُترتا ہے تصوّر ترا دل میں جیسے
چاندنی رات خرابات نشیں ہوتی ہے

گر ہی جاتا ہے کوئی قطرۂ نیساں ساقی
شدّتِ درد سے جب روحِ صدف روتی ہے

مے ٹپکتی ہے ستاروں کی نگاہوں سے عدمؔ
جب کلی باغ میں شبنم سے بدن دھوتی ہے

○

کنارے سے یہ کس کی آواز آئی
کہ طوفاں سے بوُٹے دمساز آئی

کلی کوئی چٹکی کہ شبنم کوئی چھلکا
کہاں سے ترنّم کی آواز آئی

بڑی دیر کے بعد احساس ہوگا
بڑی دیر کے بعد پرواز آئی

میں واقف ہوں اے ہمنشیں زندگی سے
کئی بار یہ شعبدہ باز آئی!

عدمؔ بارہا وقتِ بادہ گساری
صراحی سے بربط کی آواز آئی

جس کو کہتے ہیں قیامت تری رفتار تو ہے
دیکھ آئیں گے کہ ہنگامۂ بازار تو ہے

اے مغنّی ترے نغمات کی شورش برحق
کچھ مرے ذوقِ سماعت کی بھی جھنکار تو ہے

جل گئی سوزِ محبّت سے جوانی تو کیا
زندگی یوں بھی سلگتا ہُوا آزار تو ہے

بھر ہی جائے گا کہ بھرتا ہُوا ساغر ہے حیات
گر ہی جائے گی کہ گرتی ہوئی دیوار تو ہے

جل نہ جائے یہ حجابات کی دنیا ساقی
شوق کو وحشتِ آگاہیِٔ اسرار تو ہے

زیست اک سازِ صد آہنگ کی صورت تھی کبھی
خیر اب ساز کا ٹوٹا ہُوا اک تار تو ہے

ہم کو زندانِ عناصر میں بھی ہے وہمِ عدم
ایک سایہ سا پریشاں پسِ دیوار تو ہے

○

غمِ محبّت ستا رہا ہے غمِ زمانہ مَسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دل نشیں بُو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس کوئی پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ اے مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دَور چل رہا ہے

عدمؔ خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
ادھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

○

عجیب صورتِ حالات ہوتی جاتی ہے
کہ جس کا ڈر تھا وہی بات ہوتی جاتی ہے
تصورات کی رعنائیاں معاذاللہ
کہ جیسے اُن سے ملاقات ہوتی جاتی ہے
ابھی کھلے بھی نہیں تیرے عنبریں گیسو،
مگر مہکتی ہوئی رات ہوتی جاتی ہے
کچھ اس خلوص سے چھیڑا ہے ساز مطرب نے
شراب شاملِ نغمات ہوتی جاتی ہے
مرے شعور کی مستی کو ٹوکنے والے
تری نگاہ خرابات ہوتی جاتی ہے
ہوا کا رقص، گھٹا کا خرام، مے کی کھنک
ہزار رنگ کی برسات ہوتی جاتی ہے
عدم امید نہیں دل کو اب قرار آئے
کہ اُن کو خوئے عنایات ہوتی جاتی ہے

○

دل کا نقصان ہو ہی جاتا ہے
اُن کا عرفان ہو ہی جاتا ہے

مشکلیں اتنی آن پڑتی ہیں!
کام آسان ہو ہی جاتا ہے

ہم فقیروں کی بادہ نوشی کا
ساز و سامان ہو ہی جاتا ہے

آپ کے گیسوؤں کی خوشبو سے
دل پریشان ہو ہی جاتا ہے

آدمی بھی عجیب شے ہے عدمؔ
آخر انسان ہو ہی جاتا ہے

○

پھول کھلتے ہیں تو خاروں کو ہنسی آتی ہے
اِس تکلف پہ بہاروں کو ہنسی آتی ہے

بعض اوقات خِرد مند بھی یوں ہنستے ہیں
جس طرح بادہ گساروں کو ہنسی آتی ہے

پھر کوئی پھول اُڑا ہے تری انگڑائی سے
ساقیا چاند ستاروں کو ہنسی آتی ہے

سازِ دل چھیڑ تو دوں میں ترے کہنے پہ ندیم
لیکن اب ساز کے تاروں کو ہنسی آتی ہے

اے عدمؔ غیر بھلا کیوں مری حالت پہ ہنسیں
یہ غنیمت ہے کہ یاروں کو ہنسی آتی ہے

انشا پریس لاہور